بنت سمیرا کی نئی پیش کش

کشمیر مدد سیریز

فیروز سنز کی یوتھ کلب سیریز کے ممبران کے

نئے اور دلچسپ کارنامے
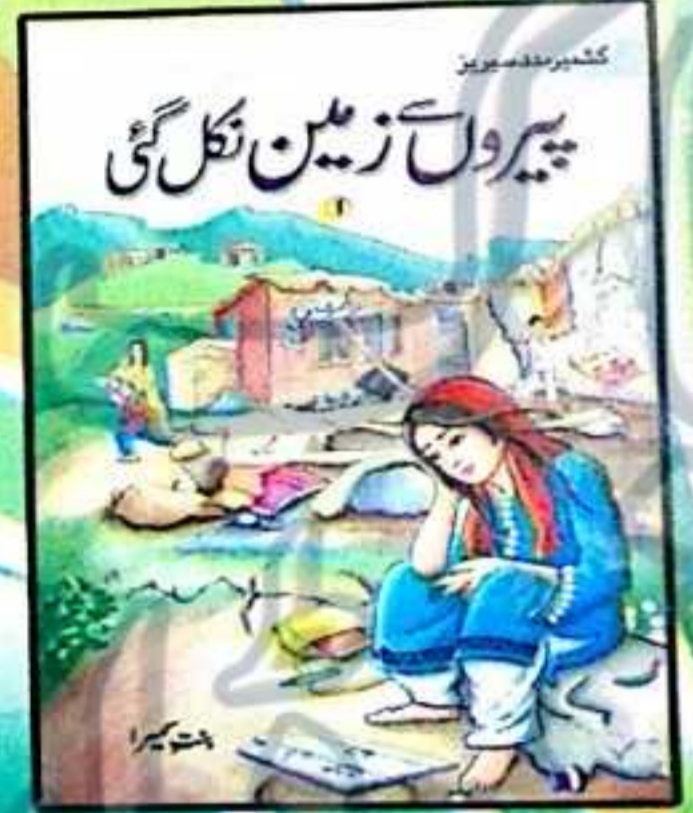
فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

ہدایات برائے آرڈرز

پنجاب: 60۔ شاہراہ قائداعظمؒ، لاہور۔ 042-111-626262

سندھ اور بلوچستان: پہلی منزل، مہران ہائیٹس، مین کلفٹن روڈ، کراچی۔ 021-35867239-35830467

خیبر پختونخواہ، اسلام آباد، آزاد کشمیر اور قبائلی علاقے: 277۔ پشاور روڈ، راولپنڈی۔ 051-5124970-5124879

75 واں سال ساتواں شمارہ
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
نومبر 2015

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

پیارے بچو! کسی امیر آدمی کا ایک غلام تھا جو نہایت محنتی، دیانت دار، متقی اور پرہیزگار تھا۔ وہ غلام اپنے ایمان اور خدا کی محبت میں جتنا پختہ تھا، اس کا آقا اس کے برعکس اتنا ہی کمزور اور نافرمان تھا۔ ایک دفعہ سردیوں میں آدھی رات کے وقت آقا نے اپنے ملازم کو حکم دیا کہ بستر سے نکل، سفر کا سامان ساتھ لے اور میرے ہمراہ چل۔ ملازم نے اپنے آقا کی پہلی آواز پر ہی گرم گرم بستر چھوڑ دیا، جلدی سے ضروری سامان باندھا اور اپنے آقا کے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں ایک مسجد سے اذانِ فجر کی آواز آئی۔

ملازم نے آقا سے کہا: ''حضور، آپ تھوڑی دیر کے لیے ایک طرف رُک جائیں، میں فجر کی نماز ادا کرلوں۔''

آقا نے کہا: ''بہت اچھا، لیکن جلدی واپس آنا۔''

ملازم نے نماز ادا کی اور عبادت میں مشغول ہو گیا۔ باہر اس کا غافل آقا انتظار کرنے لگا۔ ملازم کو ادائیگی نماز میں کافی دیر ہو گئی۔ ایک ایک کر کے تمام نمازی اور آخر میں امام مسجد بھی باہر آ گیا لیکن اس کے ملازم کی کہیں شکل دکھائی نہ دی۔

آقا نے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی: ''ارے باہر کیوں نہیں نکلتا۔'' مسجد کے اندر سے ملازم نے جواب دیا: ''آقا، کیا بتاؤں مجھے باہر نہیں آنے دیتے، تھوڑا سا اور انتظار کر لیجیے۔ تکلیف کی معافی چاہتا ہوں۔''

ملازم عبادت میں اتنا محو تھا کہ اس کے آقا نے اس کو سات بار مسجد کے دروازے پر جا کر آواز دی لیکن ہر بار غلام نے اندر سے یہی جواب دیا: ''ذرا ٹھہریے، مجھے ابھی باہر نہیں آنے دیتے۔'' ہر مرتبہ یہی جواب سن کر آقا کو بہت غصہ آیا اور کہنے لگا: ''ارے، نمازی اور امام تو سب نماز پڑھ پڑھ کر اپنے گھروں کو جا چکے، اب تُو اکیلا مسجد میں کیا کر رہا ہے؟ وہ کون ہے جو تمہیں باہر نہیں آنے دیتا۔''

ملازم نے جواب دیا: ''آقا، یہ وہی ہے جو آپ کو مسجد کے اندر نہیں آنے دیتا۔ اس نے مجھے باہر جانے سے روک رکھا ہے۔''

پیارے بچو! اس بات سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی نیت پر نیکی کی ہدایت دیتا ہے جس میں اس کی فلاح ہے۔ اگر انسان کے دل میں نیک کام کرنے کی خواہش ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی تمام منزلیں آسان کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے کے دل میں اپنی محبت پیدا کرتا ہے جس سے اس کی دُنیا و آخرت سنورتی ہے جب کہ دُنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو راہِ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں اور اپنے لیے دوزخ کا سامان اکٹھا کر رہے ہیں۔

9 نومبر شاعرِ مشرق، حکیم الامت اور مفکرِ پاکستان ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کا یومِ پیدائش ہے۔ علامہ اقبالؒ 9 نومبر 1877ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور 21 اپریل 1938ء کو لاہور میں وفات پائی۔ آپ نے اپنی شاعری کے ذریعے اپنی سوئی ہوئی قوم کو جگایا اور اسے خودی یعنی خود اعتمادی کا پیغام دیا۔ آپ نے 1930ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہٰ آباد میں آزادی کے عملی منصوبے کا ذکر کرتے ہوئے دو قومی نظریے کی روشنی میں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد اور خودمختار اسلامی مملکت کا تصور پیش کیا۔ اسی لیے آپ کو ''مصورِ پاکستان'' کہا جاتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم ان کے کلام کو سمجھیں اور اس پر سچے دل سے عمل کریں۔

آئندہ شمارے تک کی اجازت چاہتے ہیں۔ اپنا اور دوسروں کا بہت سا خیال رکھیے گا۔

فی امان اللہ! (ایڈیٹر)

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: ''یومِ اقبالؒ''

ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام
اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابدہ اصغر
سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

خط و کتابت کا پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361310-36361309 فیکس: 36278816

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)= 1000 روپے۔
مشرقِ وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے)= 2400 روپے۔
ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے)= 2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے)= 2800 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 30 روپے

حمد باری تعالیٰ

یا رب! سبھی ہیں تیرے سارا جہان تیرا
دُنیا کا ذرہ ذرہ ہے بے گماں تیرا
پھولوں کا تو ہے مالی تاروں کا تو ہے والی
ساری زمین تیری سب آسمان تیرا
دُنیا کی اس سرا کا مالک تو ہی ہے یا رب!
جو آئے اس سرا میں وہ مہمان تیرا
آنکھیں تری جہاں کی ہر شے کو دیکھتی ہیں
دُنیا میں سب کی باتیں سنتا ہے کان تیرا
جو تجھ سے ڈر رہے ہیں کیوں تجھ سے ڈر رہے ہیں
چہرا ہے تیرا پیارا ، دل مہربان تیرا

......☆......

نعت رسول مقبول ﷺ

نویدِ امن و راحت رحمۃ للعالمین لائے
بشارت نوعِ انساں کو ہوئے خیر البشرؐ پیدا
وہ جس نے عالمِ ایجاد کی تاریکیاں دھوئیں
وہ جس نے شامِ ظلمت میں کیا نورِ سحر پیدا
وہ جس نے سارے عالم کو نویدِ اوج و رفعت دی
خزف پاروں میں جس نے کر دیئے لعل و گہر پیدا
وہ جس نے بے نواؤں کو سلیمانی عطا کی تھی
غلاموں میں کیا تھا جس نے شاہوں کا جگر پیدا
ثبات وعزم وخودداری کے سب آئین سکھائے تھے
تنِ بے جان میں شاہیں کے کئے تھے بال و پر پیدا

......☆......

نوید: خوشی
اوج ورفعت: بلندی، عروج
خزف: ٹوٹی ہوئی سیپی، ٹھیکری

کسی بیمار کے پاس جا کر اس کا حال معلوم کرنا اور اس کو تسلی دینے کو ''عیادت'' کہتے ہیں۔ اسلام میں عیادت اور بیمار پرسی کو مسلمانوں کے حقوق میں شمار کیا گیا ہے اور یہ ایک مسنون عمل ہے۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ اس کا بہت اہتمام فرماتے تھے۔ چناں چہ آپؐ نے ایک مرتبہ ایک یہودی بچے کی بھی عیادت کی۔ آپؐ نے ہمیں بھی عیادت کی ترغیب دیتے ہوئے اس پر بڑے اجر و ثواب کی نوید سنائی ہے۔ ذیل میں آپؐ کے چند ارشادات نقل کیے جاتے ہیں، جن سے ہم اس عمل کی فضیلت کو جان سکیں گے۔

(1) حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جو شخص وضو کرے اور اچھی طرح وضو کرے اور ثواب سمجھ کر اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کرے تو جہنم سے ستر سال کی مسافت دُور کر دیا جاتا ہے۔'' (ابو داؤد، کتاب الجنائز:3097)

(2) حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جو شخص کسی مریض کی عیادت کرتا ہے تو آسمان سے ایک منادی یہ ندا دیتا ہے کہ تو خوش رہ اور تیرا یہ چلنا بابرکت ہو اور تو نے جنت میں گھر بنا لیا ہے۔'' (ابن ماجہ، کتاب الجنائز:1443)

(3) ایک اور حدیث میں ہے کہ ''جو مسلمان کسی مسلمان کی صبح کو عیادت کرے تو تمام دن شام تک ستر ہزار فرشتے اس پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں اور جو شام کو مسلمان کی عیادت کرے تو ستر ہزار فرشتے اس پر صبح تک رحمت بھیجتے رہتے ہیں اور اس کے لیے جنت میں ایک باغ ہو گا۔'' (ترمذی، ابواب الجنائز:969)

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بیمار پرسی کرنے سے اللہ کی رحمت حاصل ہوتی ہے، یہ جنت میں لے جانے والا اور جہنم سے بچانے والا عمل ہے، اس سے فرشتوں کی دعا بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ''مریض کو مایوس نہ کرو بلکہ زندگی کی اُمید دلاؤ، اچھا ہو جانے کی خوش خبری سناؤ اور اس کے اچھا ہونے کی دعا کرو۔'' (ترمذی، ابواب الطب:2087)

نبی پاک ﷺ جب کسی کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے تھے تو اس کو ان الفاظ میں تسلی دلاتے: لَا بَأْسَ طَهُوْرٌ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ.

''کچھ ڈر نہیں یہ بیماری گناہوں سے پاک کرنے والی ہے اگر اللہ نے چاہا۔'' (بخاری، کتاب المناقب:3616)

آپؐ کا ارشاد ہے کہ جب مریض کی عیادت کرو اور وہ مرض موت نہ ہو تو اس کے پاس سات مرتبہ یہ دعا کرو:

اَسْاَلُ اللّٰهَ الْعَظِيْمَ رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اَنْ يَّشْفِيَكَ.

''میں سوال کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے جو بڑا ہے، عرش عظیم کا رب ہے کہ تجھ کو شفاء دے۔'' (ابو داؤد، کتاب الجنائز:3106)

معلوم ہوا کہ جب عیادت کے لیے جائیں تو مریض اور اس کے رشتہ داروں کو ہر طرح سے تسلی دیں کہ ان شاء اللہ جلد شفاء ہو جائے گی اور اس تکلیف سے گناہ معاف ہوں گے اور درجات میں ترقی ہو گی اور اللہ پاک رحمت فرمائے گا۔ نیز عیادت کا ایک اہم اور ضروری ادب یہ ہے کہ اگر مریض سے خصوصی تعلق نہ ہو اور مریض کو پاس بیٹھنے سے یا کلام کرنے سے تکلیف محسوس ہو تو بیمار پرسی کر کے جلد لوٹ آئے تاکہ اس کی پریشانی کا باعث نہ ہو۔

پیارے بچو! بیمار شخص مرض کی تکلیف و شدت برداشت کرتا ہے اور ہمدردی کا طالب ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں عزیز و اقارب، احباب و مصاحب کی عیادت اور مزاج پرسی سے بیمار کو ایک گونہ تسلی ہو جاتی ہے۔ اس کی طبیعت میں فرحت و مسرت، نشاط و چستی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور بیمار کبھی اس قدر مسرور ہوتا ہے کہ اپنا مرض بھی بھول جاتا ہے۔ گویا یہ عیادت اور بیمار پرسی اس کے صحت یاب ہونے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ نیز اس سے باہمی اتفاق اور رواداری بڑھتی ہے جو کہ خیر و برکت کا باعث ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی عزیز و رشتہ دار، پڑوسی، دوست وغیرہ بیمار ہوں تو ان کی بیمار پرسی کے لیے ضرور جانا چاہیے۔ یہ ان کا حق ہے اور مسنون عمل بھی۔ اگر مریض سے تعلقات اچھے نہ بھی ہوں تو ایسے وقت میں ان کو خاطر میں نہیں لانا چاہیے بلکہ جذبہ ہمدردی سے کام لینا چاہیے۔

☆☆☆

اس روز شدید گرمی تھی۔ تاحد نظر پھیلے ہوئے لق و دق صحرا میں تپتی ریت پر دوڑتا ہوا اُونٹ اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ اُونٹ پر دو افراد سوار تھے جن میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص اور دوسرا کمسن بچہ تھا۔ طویل مسافت طے کرنے کے بعد انہیں آبادی کے آثار دکھائی دینا شروع ہوئے تو بچے کے چہرے پر چھائی تھکن تازگی میں بدل گئی۔

یہ مکہ کی آبادی تھی اور اُونٹ سوار شخصیت کا نام مُطلب تھا جو اپنے بھتیجے شیبہ کے ہمراہ مکہ آ رہے تھے۔ جب اُونٹ آبادی کے قریب پہنچا تو وہاں موجود لوگ ان کی جانب متوجہ ہونے لگے۔ پہلی نظر میں سب لوگ یہی سمجھے تھے کہ مُطلب کسی دُور دراز علاقے سے نیا غلام لے کر لوٹے ہیں۔ چنانچہ یہ منظر دیکھتے ہی انہوں نے ایک دوسرے کو ان کی آمد سے آگاہ کرنے کے لیے شور مچانا شروع کر دیا:

''مُطلب واپس لوٹ آئے ہیں...... مُطلب اپنے ساتھ ایک غلام بھی لائے ہیں......''

قریب پہنچتے ہی لوگوں کی باتیں سن کر مُطلب نے اپنا اُونٹ ایک مقام پر روکا اور پھر بچے سمیت نیچے اُتر کر ان سے مخاطب ہوئے:

''اہل قریش! تم بھی عجیب لوگ ہو کہ بنا تصدیق کیے شور مچا دیا۔ یہ بچہ غلام نہیں بلکہ میرا لاڈلا بھتیجا ہے۔ یہ میرے بڑے بھائی ہاشم کا بیٹا ہے جو ان کے انتقال کے بعد اپنی ماں کے پاس یثرب میں تھا۔ اب میں اسے اپنے ساتھ لے آیا ہوں تاکہ یثرب میں بے چارگی کی زندگی گزارنے کے بجائے عزت سے مکہ میں اپنے خاندان کے ساتھ رہے۔''

بچے کا اصل نام شیبہ تھا مگر مکہ پہنچنے پر لوگوں نے اس بچے کو دیکھتے ہی عبدالمطلب (مُطلب کا غلام) کہہ کر پکارنا شروع کر دیا اور پھر یہی نام ان کی پہچان بن گیا۔ وقت گزرتا رہا۔ عبدالمطلب اب جوان ہو چکے تھے۔ وہ نہایت ذہین اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ اہلِ قریش انہیں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کی بات توجہ سے سنی جاتی تھی۔

اسی دوران ان کے چچا مُطلب کا انتقال ہو گیا۔ چچا سے جدائی ان کے لیے نہایت کرب ناک لمحہ تھا مگر انہوں نے غم کی اس گھڑی میں ہمت اور حوصلے سے کام لیا۔ عبدالمطلب کو اپنا دکھ درد بھلا کر ان تمام ذمہ داریوں کا بار اُٹھانا تھا جو چچا مُطلب کے کاندھوں پر تھیں۔ مُطلب اپنی زندگی میں دو اہم ذمہ داریاں نہایت خوش اسلوبی سے نبھا رہے تھے جن میں سے ایک ''سِقَایہ'' یعنی مکہ میں آنے والے حاجیوں کے لیے میٹھے پانی کا انتظام کرنا اور دوسرا ''رفادہ'' یعنی آنے والے حاجیوں کے لیے ضیافت کا اہتمام کرنا۔ قریش نے منیٰ اور مکہ میں حاجیوں کی ضیافت کے لیے ایک سالانہ رقم مقرر کی ہوئی تھی۔

چچا مُطلب کے انتقال کے بعد اب یہ تمام ذمہ داریاں عبدالمطلب کو سونپ دی گئی تھیں۔ ان دنوں مکہ میں پانی کے کنویں نہیں تھے۔ لہٰذا روز مرہ ضرورت کے لیے پانی شہر کے اطراف میں

موجود کنوؤں سے لانا پڑتا تھا۔ حاجیوں کے استعمال کے لیے پانی بھی انہی کنوؤں سے لایا جاتا تھا۔ اس پانی کو محفوظ کرنے کے لیے کعبہ کے نزدیک چند حوض بنائے گئے تھے۔ چونکہ حج کے دنوں میں پانی وافر مقدار میں درکار ہوتا تھا اس لیے ان تالابوں کو بھرتے رہنا پڑتا تھا، جب کہ ان کی صفائی کا مسئلہ الگ سے درپیش رہتا تھا۔

یہ سارے مسائل عبدالمطلب کے لیے نہایت پریشانی کا سبب بنے رہتے تھے۔ ان دنوں پانی کی شدید قلت تھی اور طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود اہلِ مکہ کو یہ حقیقت بھی یاد تھی کہ چاہ زم زم کا پانی نہایت شیریں اور خوش ذائقہ تھا۔ یہ پانی کبھی خشک نہیں ہوتا تھا اور جتنی ضرورت ہو حاصل کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ جب پریشانی زیادہ بڑھی تو عبدالمطلب کو زم زم کا خیال آیا۔ انہوں نے اس سلسلے میں لوگوں سے دریافت کرنا شروع کیا کہ زم زم کو کیوں اور کس نے پاٹا تھا۔ ان کا سوال سن کر لوگوں نے پہلے تو اس استفسار پر حیرت کا اظہار کیا اور پھر کچھ یوں تفصیل بتائی:

”برسوں پہلے یہاں قبیلہ جرہم کی حکومت تھی۔ ان کا آخری سردار مضاض جرہمی تھا۔ جب اس کی قوم راہِ راست سے بھٹک کر بربادی کے راستے پر چل نکلی تو قبیلہ بنوخزاعہ کو بہت ناگوار گزرا اور انہوں نے جرہم کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ پھر دونوں قبائل کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں فتح بنوخزاعہ کو حاصل ہوئی۔ شکست کے بعد جرہم کو وہاں سے جانا پڑا۔ مضاض جرہمی عبرت ناک شکست کھانے کے بعد انتقام کی آگ میں جل رہا تھا، مگر اب بنو خزاعہ سے مقابلہ کرنا اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ جب اس کے علاقہ چھوڑنے کا وقت قریب آیا تو اس نے کعبہ میں موجود چڑھائے جانے والے نذرانے اکٹھے کر کے زم زم کے کنویں کے اندر ڈال دیئے اور پاٹ کر برابر کر دیا۔ یوں اس دن کے بعد سے اہلِ مکہ، زم زم سے محروم ہو گئے۔“

تفصیل سن کر عبدالمطلب خاموش ہو گئے اور دل ہی دل میں عہد کیا کہ جب تک میں زم زم کی کھدائی اور صفائی کر کے پہلے کی طرح قابلِ استعمال نہیں بنا لیتا، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔

اب عبدالمطلب ہر وقت اپنے عزم کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ ایک رات وہ اپنے گھر میں سو رہے تھے کہ یکا یک ایک آواز سنائی دی: ”زم زم کی کھدائی کرو۔“

پھر یہ غیبی آواز اکثر سنائی دینے لگی جس سے ان کا حوصلہ مزید بڑھا اور انہوں نے کھدائی کے کام کا آغاز کر دیا، مگر یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ انہیں اس سلسلے میں جان توڑ محنت کرنا پڑی۔ آخرکار دل کی مراد پوری ہوئی اور وہ زم زم کے پانی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

کھدائی کے دوران چاہ زم زم سے کافی مقدار میں سامان ملا جس میں مضاض جرہمی کی تلواریں اور خانہ کعبہ کے نذرانوں میں شامل سونے کے دو ہرن بھی شامل تھے۔ عبدالمطلب نے تلواروں سے کعبہ کے دروازے بنوائے اور ہرنوں کو ان کے دونوں طرف رکھ دیا تاکہ کعبہ کی زینت بڑھے۔ زم زم کی کھدائی آسان کام نہیں تھا۔ عبدالمطلب اتنی محنت کرنے کے بعد تھک کر چور ہو گئے تھے۔ اس کام کو تنہا سرانجام دینے پر انہیں اس بات کی کمی شدت سے محسوس کی کہ اگر ان کے زیادہ بیٹے ہوتے تو آج ان کا ہاتھ ضرور بٹاتے، کیوں کہ اس وقت تک ان کا ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام حارث تھا۔ لہٰذا انہوں نے اس موقع پر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی:

”خدایا! اگر تو مجھے دس بیٹے عطا فرمائے اور سب کے سب جوان ہو کر میرا ہاتھ بٹانے لگیں تو ایک کو تیرے نام پر قربان کر دوں گا۔“

عبدالمطلب کی دلی آرزو پوری ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں دس بیٹے عطا کر دیئے۔ عبدالمطلب کو اپنے بیٹوں سے بہت محبت تھی۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کی بہت اچھے طریقے سے پرورش کی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سب بیٹے جوان ہو کر اپنے والد کا ہاتھ بٹانے لگے۔

عبدالمطلب اپنی خواہش کی تکمیل کے باوجود، رب سے کیا وعدہ نہیں بھولے تھے۔ تمام بیٹے جوان ہو چکے تھے اور اب نذر پوری کرنے کا وقت آن پہنچا تھا۔ ایک روز عبدالمطلب نے سب بیٹوں کو پاس بلایا اور انہیں سارا قصہ سنا ڈالا۔ والد کی بات سن کر بیٹوں نے ادب سے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا:

”ابا جان! ہم سب دل و جان سے حاضر ہیں۔ آپ جس بیٹے کو چاہیں قربان کر دیں۔“ اولاد کی فرمانبرداری دیکھ کر عبدالمطلب کا سر فخر سے بلند ہو گیا، مگر ایک باپ ہونے کے ناتے یہ فیصلہ کرنا ان کے لیے بہت مشکل مرحلہ تھا کہ کس بیٹے کی قربانی دی جائے۔

بہت دیر سوچنے کے بعد انہوں نے سب بیٹوں کو حکم دیا کہ الگ الگ تیروں پر اپنا اپنا نام لکھ لاؤ۔ حکم ملتے ہی تعمیل کی گئی اور ہر بیٹا الگ تیر پر اپنا نام لکھ لایا۔ تیر حاصل کرنے کے بعد

عبدالمطلب بیٹوں کو وہیں چھوڑ کر خود کعبہ میں آ گئے اور فال نکالنے والے شخص سے ملاقات کی۔ انہوں نے تمام تیر اس شخص کے حوالے کر دیئے تاکہ وہ فال نکال کر معلوم کر سکے کہ سب سے مقدس بت ان کے کس بیٹے کی قربانی پسند کرے گا۔

اس وقت مکہ میں رواج تھا کہ جب بھی کوئی اہم کام درپیش ہوتا تھا، لوگ تیروں سے فال نکالنے والا مخصوص شخص حاجت مند کے تیر لے جاتا تھا اور بُت کے سامنے ایک خاص طریقے سے گھماتا تھا۔ گھومنے کے بعد اگر تیر کا منہ بُت کی جانب ہو جاتا تو اسے دیوتا کی رضامندی سمجھ لیا جاتا تھا۔ بتوں کی مرضی معلوم کرنے کا یہ طریقہ وہاں عام تھا۔ عبدالمطلب نے بھی اسی پر عمل کیا۔ چنانچہ جب فال نکالنے والے شخص نے تیر بُت کے سامنے گھمائے تو سب سے چھوٹے بیٹے عبداللہ کا نام نکل آیا۔

عبداللہ کا نام سن کر عبدالمطلب کے دل کو دھچکا سا لگا تھا۔ وہ ان کے سب سے چہیتے بیٹے تھے۔ تمام بھائی بھی عبداللہ سے بہت پیار کرتے تھے مگر اب فیصلہ ہو چکا تھا۔ ہبل دیوتا نے انہی کی قربانی مانگی تھی اور اب انہیں ذبح کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

عبدالمطلب نے فیصلہ ہو جانے کے بعد اپنے لاڈلے بیٹے کا ہاتھ پکڑا اور انہیں چاہ زم زم کے پاس لے آئے۔ قربان گاہ وہیں واقع تھی اور جس شخص کو جو بھی قربان کرنا ہوتا، وہیں لا کر کرتا تھا۔

ادھر یہ خبر اہلِ مکہ کے دلوں پر بجلی بن کر گری کہ عبدالمطلب اپنے بیٹے عبداللہ کو قربان کرنے والے ہیں۔ اطلاع ملتے ہی جو جس حال میں تھا عبدالمطلب کی طرف دوڑ پڑا۔ کچھ ہی دیر میں سب لوگ ان کے پاس جمع ہو گئے۔ ہر شخص یہی اصرار کر رہا تھا کہ عبدالمطلب اپنا ارادہ بدل دیں اور عبداللہ کو ذبح نہ کیا جائے۔

''میں نذر مان چکا ہوں اور اپنا وعدہ پورا کرنا بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اور کیا صورت ہو سکتی ہے؟''

یہ سن کر لوگوں نے تجویز پیش کی: ''اگر مالِ فدیہ بن سکے تو ہم راضی ہیں...... اور اگر اُونٹ ذبح کرنے سے کام بن سکتا ہے تو اس کے لیے بھی تیار ہیں۔''

دیر تک اس مسئلے پر بحث ہوتی رہی۔ مختلف تجاویز پیش کی گئیں اور پھر باہمی مشاورت کے بعد سب لوگ اس بات پر متفق ہو گئے کہ یثرب کے قریب ایک ایسی عورت رہتی ہے جو الجھی ہوئی گتھیاں سلجھانے میں ماہر سمجھی جاتی ہے۔ اس مشکل وقت میں ہمیں اپنے مسئلے کا حل معلوم کرنے کے لیے اسی سے رجوع کرنا چاہیے۔

فیصلہ ہونے کے بعد مکہ سے لوگوں کا ایک وفد جا کر اس عورت سے ملا اور سارا قصہ بیان کیا۔ عورت نے ان کی بات توجہ سے سنی اور پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد سوال کیا:

''اگر کسی قیدی کو چھڑانا ہو یا مجرم کی جان بچانی ہو تو تم لوگ کتنا فدیہ دیتے ہو۔'' ''دس اُونٹ۔''

لوگوں نے جواب دیا تو عورت بولی:

''دس اُونٹ اور عبداللہ کے نام کا قرعہ ڈالو، اگر اُونٹوں کے نام قرعہ نکل آئے تو بہتر ہے ورنہ دس اُونٹ کر دو۔ اگر پھر بھی عبداللہ کا نام نکلے تو دس اور بڑھا دو...... اسی طرح دس دس اُونٹ بڑھاتے چلے جاؤ، یہاں تک کہ تمہارا رب راضی ہو جائے۔

عورت سے حل معلوم کرنے کے بعد وفد واپس مکہ لوٹ آیا اور باقی لوگوں کو ساری بات سے آگاہ کیا۔ سب نے یہ تجویز سن کر رضامندی کا اظہار کیا اور قرعہ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

اس موقع پر دس اُونٹ اور عبداللہ کے نام کا قرعہ ڈالا تو عبداللہ کا نام نکل آیا۔ پہلی کوشش میں ناکامی کے بعد دس اُونٹ مزید بڑھا دیئے مگر نام عبداللہ کا ہی نکلا۔ لہٰذا دس اُونٹوں کا مزید اضافہ کر دیا گیا مگر ایک مرتبہ پھر عبداللہ کا نام نکل آیا۔ لوگ ہر صورت عبداللہ کو بچانا چاہتے تھے، اس لیے ہر کوشش میں ناکامی پر دس اُونٹ بڑھانے لگے مگر نام مسلسل عبداللہ کا ہی نکل رہا تھا۔

ادھر عبدالمطلب عاجزی کے ساتھ دعا میں مصروف تھے:

''خدایا! فدیہ کو قبول کر لے اور عبداللہ کی جان بخش دے۔''

قرعہ بار بار ڈالا جا رہا تھا اور ہر مرتبہ نام عبداللہ کا ہی نکل رہا تھا۔ جب بڑھتے بڑھتے اُونٹوں کی تعداد سو ہو گئی تو قرعہ اُونٹوں کے نام نکل آیا۔ لوگ اس کامیابی پر خوشی سے جھوم اُٹھے تھے اور عبدالمطلب کو ہر طرف سے مبارک باد دی جا رہی تھی کہ عبداللہ کا فدیہ قبول کر لیا گیا ہے، مگر عبدالمطلب ابھی تک دلی طور پر مطمئن نہیں ہوئے تھے۔

چناں چہ دوبارہ قرعہ ڈلوایا گیا کہ خدا کی مرضی واضح طور پر معلوم ہو سکے اور کسی کے دل میں شبہ نہ رہ جائے۔ خدا کی قدرت کہ اس مرتبہ بھی قرعہ سو اُونٹوں کا نکل آیا جس پر سب نے اطمینان کا اظہار کیا اور سو اُونٹ ذبح کر دیئے گئے۔

☆☆☆

اس بار فصلیں بہت اچھی ہوئی تھیں۔ وہ کھیتوں کے درمیان میں ایک پگڈنڈی پر کھڑا مسرور نظروں سے ہر طرف لہلہاتی ہوئی گندم کی فصل کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے نرم خوشے ٹھنڈی ہوا میں جھوم رہے تھے، جیسے ان پر بے خودی کی کیفیت طاری ہو۔ انہیں دیکھ کر اس کا دل بھی خوشی سے جھوم رہا تھا۔ بس چند دنوں ہی کی تو بات تھی، اس کے بعد اس کا گودام گندم کے دانوں سے بھر جاتا۔ فصلیں ہی تو کسان کا اثاثہ ہوتی ہیں۔ وہ پتا نہیں کیا کیا منصوبے بناتا کہ فصل کاٹنے کے بعد یہ کرنا ہے، وہ کرنا ہے۔ ہزار کام نکل آتے ہیں اور پھر اوپر سے...... جی ہاں، اوپر سے جو غریب غرباء کٹائی والے دن حصہ مانگنے آجاتے تھے ناں، وہ چودھری رب نواز کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے لیکن کیا کرتا...... ریت رواج پر بھی چلنا پڑتا ہے۔ اس گاؤں میں رواج تھا کہ جب فصل تیار ہو جاتی، اناج کے ڈھیر لگ جاتے تو گاؤں کے غریب اور نادار لوگ وہاں پہنچ جاتے۔ کسان خوشی خوشی انہیں حسب استطاعت غلہ دے دیتے۔ اس طرح ان کا چولہا جلنے کا سامان بھی ہو جاتا لیکن چودھری رب نواز کو وہ زہر لگتے تھے۔ یہ بات بھی نہیں تھی کہ اسے غریبوں سے نفرت تھی۔ وہ باقاعدگی سے زکوٰۃ بھی دیتا تھا لیکن عشر اس نے کبھی نہ نکالا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ فصلوں پر صرف اسی کا حق ہے، جس کی زمین ہے۔ جس نے محنت کی ہے اور سرمایہ لگایا ہے۔ وہ لہلہاتی ہوئی گندم کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ ''اس بار میں اچانک ہی ہارویسٹر لگا دوں گا تاکہ لوگوں کو پتا ہی نہ چلے اور میں گندم گھر لے آؤں۔ اگر وہ گھر بھی آگئے تو میں یہ کہہ کر انہیں آسانی سے ٹال دوں گا کہ گندم دینے کا رواج تو صرف کھیتوں میں ہے، آپ لوگ گھر میں کیوں آگئے۔ اس طرح میں گندم بھی بچا لوں گا اور برادری میں میری مونچھ بھی نیچی نہ ہوگی۔''

یہی سب کچھ سوچتا ہوا وہ گھر کی طرف چل پڑا۔

☆......☆

''ابا جان! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' فیصل نے حیرانی سے چودھری رب نواز کی طرف دیکھا۔ فیصل، چودھری نواز کا اکلوتا بیٹا تھا اور حال ہی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آیا تھا۔ اسے اسلام اور اسلامی اقدار سے خصوصی دل چسپی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے باپ کی بات سن کر حیران رہ گیا تھا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بیٹے! کماتے ہم ہیں اور کھاتے وہ ہیں۔ خود کما کر کھائیں، ہم نے کیا ان کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے کہ ہر سال جھولیاں

بھر بھر کر انہیں اناج دیں۔" چودھری رب نواز نے تلخی سے کہا۔

"لیکن ابا جان! غریبوں کا بھی تو ہمارے مال پر حق بنتا ہے..... " اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"ان لوگوں کے مالوں میں ایک مقررہ حصہ ہے۔ اس کے لیے جو مانگے اور جو مانگ بھی نہ سکے تو محروم رہے۔" (المعارج، آیت 25-24)

"کھاؤ اس کا پھل جب پھل لائے اور اس کا حق دو جس دن کٹے۔"

(سورۃ الانعام، آیت: 141)

فیصل نے انہیں دلائل سے قائل کرنا چاہا تھا۔

"میں کچھ نہیں جانتا، یہ خالصتاً ہماری محنت ہے۔ اس پر صرف ہمارا حق بنتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں ہر سال باقاعدگی سے زکوٰۃ نکالتا ہوں لیکن یہ فصلوں والا معاملہ میری برداشت سے باہر ہے۔" چودھری رب نواز نے ضد میں آ کر کہا۔

"بابا جانی! کیا پتا، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی انہی غریبوں کے صدقے دے رہا ہو۔ میں آپ کو تین بھائیوں کا قصہ سناتا ہوں جو قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے ہماری عبرت کے لیے بیان فرمایا ہے۔" فیصل کہتا چلا گیا۔ اس نے پورا قرآنی واقعہ بھی بیان کیا تھا لیکن چودھری رب نواز ہنس کر بولا تھا۔ "فیصل بیٹے! ہمیں تو صرف اتنا معلوم ہے کہ اسلام کے پانچ ارکان ہیں..... اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی گواہی دینا، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج..... بس!"

☆..... ☆..... ☆

رات کو بڑے زور کی بارش ہوئی تھی۔ گرج چمک اتنی خوف ناک تھی کہ کلیجہ منہ کو آتا تھا اور پھر اولے اتنی کثرت سے پڑے تھے کہ زمین سفید ہو گئی تھی۔ رات بڑی بے چینی سے کٹی تھی۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ اپنے کھیتوں میں جا پہنچا تھا لیکن وہاں کی حالت دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ اس کی لہلہاتی فصل بُری طرح تباہ ہو چکی تھی۔ ژالہ باری اتنی شدید تھی کہ اس نے گندم کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ چودھری رب نواز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے وہ واقعہ یاد آنے لگا، جو اس کے بیٹے فیصل نے چند دن پہلے ہی سنایا تھا لیکن اس نے سنی اَن سنی کر دی تھی۔ اب وہ واقعہ کسی فلم کی طرح اس کے ذہن کے پردے پر رقص کر رہا تھا۔

"صنعاء (یمن) سے دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک سرسبز و شاداب باغ تھا، جس کا نام 'ضروان' تھا۔ اس کا مالک ایک مردِ صالح تھا، جو باغ کے میوے کثرت سے فقراء کو دیتا تھا۔ اس کے علاوہ 'عُشر' بھی نکالتا تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے تین بیٹے وارث ہوئے تو کہنے لگے کہ اگر والد صاحب کی طرح ہم نے بھی خیرات جاری رکھی تو تنگ دست ہو جائیں گے کیوں کہ ہمارا کنبہ بڑا ہے۔ چناں چہ ایک بھائی کہنے لگا کہ اس بار ہم صبح سویرے باغ میں جائیں گے، تاکہ ان غریبوں کو پتا ہی نہ چلے اور ہمیں پھل نہ دینے پڑیں اور پھر صبح تڑکے وہ اپنے باغ کی طرف چل پڑے۔ وہ راستے میں ایک دوسرے سے کہتے جاتے تھے۔ "خبردار! آج کوئی غریب مسکین باغ میں داخل نہ ہونے پائے۔" اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ حرکت بالکل پسند نہ آئی۔ اس نے آسمان سے ایسی بجلی بھیجی جس نے ان کے ہرے بھرے باغ کو جلا کر راکھ کر دیا۔ جب وہ تینوں بھائی وہاں پہنچے تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ خود سے کہنے لگے۔ "یقیناً ہم راستہ بھول کر کسی اور طرف آ نکلے ہیں۔"

جب سورج نکلا تو ان پر یہ اندوہناک انکشاف ہوا کہ وہ پہنچے تو ٹھیک جگہ پر تھے لیکن ان کی خودغرضی کے سبب ان کا باغ جل کر خاکستر ہو چکا تھا۔ جس جگہ پھلوں سے لدے ہوئے سرسبز و شاداب درخت ہوا کرتے تھے، وہاں اب ان کے ارمانوں کی راکھ اُڑ رہی تھی۔

..... اور یہی راکھ چودھری رب نواز کے دل میں بھی اُڑ رہی تھی۔ اس کے ہرے بھرے کھیت بھی اس کی خودغرضی کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔

"لیکن قصہ شاید آگے بھی تھا۔" چودھری رب نواز نے سوچا۔

"ہاں، یاد آیا..... ان بھائیوں نے سچی توبہ کی تھی اور کہا تھا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم سے یہی اُمید ہے کہ وہ ہمیں اس سے بہتر باغ عطا فرمائے گا..... تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے بہتر باغ عطا فرمایا جس کا نام 'باغِ حیوان' تھا۔ اس میں کثرتِ پیداوار اور لطافت کا یہ عالم تھا کہ اس کے انگوروں کا ایک خوشہ ایک گدھے پر بار کیا جاتا تھا۔"

(القلم، آیت 32-17، تفسیر خزائن العرفان از سید نعیم الدین مراد آبادیؒ)

چودھری رب نواز نے بھی اللہ تعالیٰ کے حضور سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اس نے سچے دل سے توبہ کر لی۔

جس طرح جلی ہوئی راکھ سے بھی ایک نہ ایک دن زندگی جنم لیتی ہے، اسی طرح اس کے دل میں بھی ایک نیا جذبہ جنم لے رہا تھا۔ غریبوں کی ہر ممکن امداد کا جذبہ..... ان کے دکھ درد بانٹنے کا جذبہ..... ارمانوں کی راکھ سے ایک نیا جہان پیدا ہو رہا تھا۔ ☆☆

بچوں نے اک ترکیب سوچی — بات بہت عجیب سوچی

عیدی لی سنبھال سب نے — کیا بہت کمال سب نے

سوچا باہر چلتے ہیں — ہلا گلا کرتے ہیں

اچھے کھانے کھائیں گے — فن لینڈ بھی جائیں گے

پیارے پیارے کپڑے پہنے — لگتے تھے سونے کے گہنے

وہ جیسے کھانا کھانے بیٹھے — تھوڑا سا ستانے بیٹھے

خوشیاں ہر سو پلتی تھیں — خوش گپیاں بھی چلتی تھیں

اک بابے کو آتا دیکھا — گرمی سے گھبراتا دیکھا

پکڑے ہوئے تھا سوٹی کو — دیکھ رہا تھا روٹی کو

پیاس تھی اس کی آنکھوں میں — اور تلاطم سانسوں میں

بھول گئے بچے تو کھانا — لیکن سب کے دل نے مانا

کھانا کھایا سب نے مل کر — پیار دکھایا سب نے مل کر

جو بچوں کو یہ سمجھائیں — کتنی اچھی ہیں وہ مائیں

بابا خوش تھا بچوں سے — کھانا کھا کر بچوں سے

بچو! اچھے کام کرو گے — روشن اپنا نام کرو گے

کون کہے یہ چھل جائے گا — کچھ نہ کچھ بدل جائے گا

(احمد عدنان طارق)

چھل: دھوکہ، فریب

تلاطم: موجوں کا زور، جوش

گہنے: زیور

ڈاکٹر جاوید اقبال 5 اکتوبر 1924ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی ابتداء سیکرڈ ہارٹ مشن اسکول لاہور سے کی۔ اس کے بعد سینٹ فرانسس سے مڈل پاس کیا۔ اسلامیہ ہائی اسکول بھاٹی گیٹ سے میٹرک پاس کیا۔ انہوں نے 1944ء میں گورنمنٹ کالج سے ایم اے انگریزی کی ڈگری حاصل کی، اور پھر اسی کالج سے 1948ء میں ایم اے فلسفہ کیا۔ 1954ء میں یونی ورسٹی آف کیمبرج سے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی اور پھر لنکنز ان سے 1956ء میں بیرسٹر ایٹ لاء کی ڈگری لی۔ لنکنز ان جانا ان کا ایک خواب تھا، اس خیال سے کہ ان کے قائد محمد علی جناح نے اس جگہ سے قانون پڑھا تھا۔

علامہ اقبالؒ نے ڈاکٹر جاوید اقبال کی تربیت پر خصوصی توجہ دی تھی اور ''جاوید نامہ'' میں ان کے سامنے امکانات کا ایک نیا جہان آباد کر دیا تھا اور نئے صبح و شام پیدا کرنے کا پیغام دیا تھا۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

آپ نے اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں اقبالؒ کے اہل بیٹے کے طور پر ثابت کرنے میں گزاری۔ انہوں نے اقبال کے پیغام کو سمجھانے کے لیے کئی تصانیف مرتب کیں۔ اُردو تصانیف میں مئے لالہ فام، زندہ رُود، افکارِ اقبال، اسلام اور پاکستان کی شناخت، اپنا گریباں چاک کر، جاوید صاحب کے افکار، اسلام اور ملتِ اسلامیہ اور پھر قائداعظم کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال ایک ممتاز دانش ور، فلسفی، قانون دان اور اجتہاد کے سرخیل تھے۔ انہوں نے اقبالؒ کی سوانح حیات زندہ رُود لکھی جو اقبالؒ پر ایک مکمل کتاب ہے۔

بقول ڈاکٹر جاوید اقبال کہ میری زندگی کا بڑا حصہ اقبالؒ کو پڑھنے میں گزرا ہے۔ میری یہ کوشش رہی ہے کہ اقبالؒ کے افکار کو عام آدمی کے لیے قابلِ فہم بنا سکوں اور ان تک پہنچا سکوں۔ یہ کام ایک منظم اور اداراتی انداز سے کیا جانا چاہیے اور لاہور میں دبستانِ اقبال کی صورت میں ایک ایسا مرکز قائم کیا گیا ہے جہاں اقبالؒ سے محبت کرنے والوں اور فکرِ اقبال سے شناسائی چاہنے والوں کے مواقع موجود ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے دبستانِ اقبال کو ایک امتیازی خصوصیت سے نوازا ہے۔ یہاں پر خطبات اقبال پر غور و فکر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اُردو زبان کے فروغ کے لیے گہری دل چسپی لی اور بہت کوششیں کی۔

ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال فرزندِ اقبال کے علاوہ جمہوری اور آزاد سوچ رکھنے والے عظیم دانش ور تھے۔ وہ ایک ملن سار اور منسکرالمزاج ہستی تھے۔ انہوں نے 91 سال عمر پائی اور 4/ اکتوبر 2015ء کو لاہور میں وفات پائی۔

☆☆☆

اس وقت تک سرکس کے ہر حصے میں زور و شور سے کام شروع ہو چکا تھا۔ ہتھوڑوں کی کھٹا کھٹ فضا میں گونج رہی تھی۔ بڑے خیمے کو نصب کرنے میں بے شمار آدمیوں کے ساتھ ہاتھی بھی جتے ہوئے تھے۔ انجینئروں نے خیمے کی چھت کے پاس تار اور پائپ فٹ کیے، جن پر فن کار لڑکیوں کو جمناسٹک کا مظاہرہ کرنا تھا۔ تماشائیوں کے لیے سیٹیں آراستہ کی گئیں۔ منیجر اور رنگ ماسٹر اِدھر اُدھر چل پھر کر جائزہ لے رہے تھے اور کارکنوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے انہیں شاباش دے رہے تھے۔

عامر اور عمار بھی ہر چیز کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ معائنہ کرتے ہوئے ماریانا کے قریب سے گزرے، وہ بھی سانپوں کے بکسوں کو ایک جگہ ترتیب سے رکھوانے میں مصروف تھی۔ لڑکوں نے چند منٹ اس کے قریب رُک کر سانپوں کو دیکھا۔ رات والا ناگ اپنے بکس میں ایک بہت بڑے تودے کی طرح پڑا تھا۔ ماریانا نے لڑکوں کی طرف بالکل توجہ نہ دی اور وہ اس کے قریب سے گزر کر آگے نکل گئے۔ عامر نے بھائی سے کہا:

''اس خوف ناک ناگ کو اس عورت کی مدد کے بغیر نکال کر لے جانا ممکن نہیں۔ مجھے تو اس پر بھی شبہ ہے۔''

''بالکل! اس کا رویہ بھی مشکوک ہے۔'' عمار نے تائید کی۔

ڈبے جوڑ کر اور ان پر کپڑے کے پردے ڈال کر بکنگ آفس بنا دیا گیا تھا، جہاں لڑکوں کا نیا دوست جا کو ٹکٹوں کی کاپیاں گن رہا تھا۔ اس کو سلام کرتے ہوئے وہ آگے بڑھے ہی تھے کہ یکا یک کوئی شخص پردے کے پیچھے سے نکل کر ان کے راستے میں آن گرا۔ انہوں نے چونک کر دیکھا تو ایک دم سناٹے میں آ گئے!

''زومبی!'' عمار نے گھگیاتے ہوئے کہا۔ عامر بھی دم سادھے اس کے سفید چہرے اور آنکھوں کے کھوکھلے حلقوں سے گھورتی ہوئی آنکھوں کو خوف زدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

زومبی نے قہقہہ لگا کر عامر کے کندھے پر ہاتھ مارا اور بولا:

''واہ دوست! ڈر گئے؟ ارے بھئی، میں آرکن ہوں۔ رات آپ کو بتایا تو تھا کہ میں سائڈ شو میں ہیٹن سپاہی کی زومبی کا پارٹ ادا کرتا ہوں۔ بھول گئے؟'' دونوں لڑکے کھسیانے ہو کر ہنسنے لگے۔ انہوں نے باری باری آرکن سے ہاتھ ملایا۔

''اس سے یہ ثابت ہوا کہ میرا رول اچھا خاصا ڈراؤنا ہے۔ ڈر گئے ناں آپ؟'' وہ خوش ہو کر بولا۔

''میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔'' عمار بولا۔

''بھلا یہ زومبی بننے کا خیال آپ کو کیسے آیا؟'' عامر نے پوچھا۔

''میں اپنا رول علاقائی روایتوں کے مطابق بدلتا رہتا ہوں۔

اس علاقے میں کسی ہیبتن سپاہی کی زومبی کا قصہ مشہور ہے۔ میں نے سوچا، چلو، یہاں زومبی کا روپ دھار لو۔'' آرکن نے بتایا۔

''کیا آپ توجا کے اس علاقے میں کبھی گئے ہیں جہاں یہ زومبی والا قصہ مشہور ہے؟'' عمار نے پوچھا۔

آرکن دونوں ہاتھ اُٹھا کر بولا: ''نہ بھئی، میں وہاں جا کر سچ مچ کی زومبی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ اچھا، اب رخصت چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے شو کی تیاری کرنی ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ اپنے کیبن میں چلا گیا۔

''کیا خیال ہے؟ کیا وہ سچ کہہ رہا تھا؟ تم نے دیکھا، اس کی یونی فارم کے بٹن تو پورے تھے؟'' عمار نے کہا۔

''بٹنوں کا کیا ہے۔ ممکن ہے اس نے توجا سے آنے کے بعد نیا بٹن ٹانک لیا ہو۔'' عامر نے جواب دیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد تماشائی ہجوم در ہجوم جمع ہونے لگے۔ ساری نشستیں پُر ہو گئیں۔ عامر اور عمار بھی بڑے خیمے میں آ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں سابو ان کے پاس سے گزرا اور بولا: ''میں اوپر کے تار کو چیک کرنے جا رہا ہوں۔'' اور پھر بڑی تیزی سے ان آہنی سلاخوں اور پائپوں کے اوپر چڑھنے لگا جہاں لڑکیوں کو جمناسٹک کے کرتب پیش کرنا تھے۔

اس نے اوپر کی سلاخوں تک پہنچ کر آخری تار کو جھٹکا دیا تو وہ ٹوٹ گیا اور دہشت زدہ چیخ کے ساتھ سابو کئی فٹ کی بلندی سے نیچے کی طرف لڑھکا۔ گرتے گرتے اس کا ہاتھ ایک پائپ پر پڑ گیا، جسے پکڑنے میں وہ کام یاب ہو گیا۔ اسے اپنے سر پر لٹکتے دیکھ کر تماشائی نشستوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مرد مکے تان تان کر چلا رہے تھے۔ عورتیں چیخیں مار رہی تھیں۔ بچے رو رہے تھے۔ سرکس کے عملے میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔

ٹارسکی اور سوڈانی رنگ ماسٹر دروازے پر کھڑے کانپ رہے تھے مگر سابو نے بڑی حاضر دماغی اور حوصلے سے کام لیا۔ ٹوٹا ہوا تار اس کے قریب ہی لٹک رہا تھا۔ وہ کھسکتا ہوا اس کے قریب آیا اور لپک کر اسے پکڑ لیا۔ پھر اسے مناسب زاویے سے، جہاں دو پائپ جڑے ہوئے تھے، پھنسایا اور کمند کی طرح لٹک کر نیچے اُترنے لگا۔ جب سرکس کا عملہ جال لے کر پہنچا تو سابو صحیح سلامت فرش پر کھڑا تھا مگر تماشائی اب بھی بے چینی کا مظاہرہ کر رہے تھے اور مطالبہ کر رہے تھے کہ ان کی رقم واپس کی جائے۔

لوگ طیش میں آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ اس وقت اگر انہیں پتا چل جاتا کہ منیجر کون ہے تو یقیناً وہ ٹارسکی کی تکا بوٹی کر ڈالتے مگر یکایک یہ جوشیلے نعرے اور غضب ناک آوازیں دھیمی پڑ گئیں۔ بچوں کی تالیاں اور قہقہے بلند ہونے لگے۔ لوگ اپنی نشستوں پر بیٹھنے لگے۔ جو باہر نکل گئے تھے، وہ واپس آ گئے اور رنگ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

رنگ میں ایک جوکر کھڑا، جھک جھک کر تماشائیوں کو سلام کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سرخ اور سفید پینٹ لگا ہوا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ اس نے پھٹا ہوا بڑا سا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ سفید قمیص پر لمبی سی واسکٹ تھی اور ڈھیلی ڈھالی پینٹ کے نیچے مڑی ہوئی ٹو والے لمبے لمبے جوتے تھے۔ اس کے کندھے پر ایک بندر بیٹھا ہوا کچھ کھا رہا تھا اور ساتھ ساتھ تماشائیوں کو منہ بھی چڑا رہا تھا۔

مسخرے کے ہاتھ میں چھڑی تھی، جسے وہ چاروں طرف گھما رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ایک جھنڈا تھا جسے تماشائیوں کی طرف جھلا رہا تھا۔ سب دل چسپی سے اسے دیکھنے لگے۔ اس نے ستانے کے انداز سے اپنی چھڑی پر سہارا لیا تو وہ ٹوٹ گئی۔ مسخرا لڑھک کر زمین پر آ رہا۔ پھٹا ہوا ہیٹ دُور جا گرا۔ بندر نے ہیٹ اُٹھایا، لپک کر پھر مسخرے کے کندھے پر جا بیٹھا اور ہیٹ اس کے سر پر پہنا دیا۔ اس کے بعد مسخرا جھنڈا لہراتا ہوا، پورے رنگ کا چکر کاٹ کر، تالیوں کے بے پناہ شور میں، تماشائیوں کے سامنے تعظیم کے لیے جھکا۔ بندر بھی ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر تماشائیوں کے سامنے جھک گیا۔ پھر دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پردے کے پیچھے چلے گئے۔ تالیوں کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔

''بھئی، تم نے تو آج ہمیں بچا لیا۔'' سرکس کے لوگوں نے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔ وہ ہنسنے لگا۔ پھر چاروں طرف نگاہ دوڑا کر پوچھا: ''عمار کہاں ہے؟''

''عمار؟ ہاں سچ۔ عمار کہاں ہے؟'' عامر نے بھی اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ اس ہنگامے میں اسے اپنے بھائی کا خیال نہ رہا تھا۔ باقی سب بھی فکر مند ہو کر عمار کو تلاش کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر مسخرا خوب ہنسا اور چلا کر بولا: ''یہ رہا عمار!''

''کہاں؟'' سب نے ایک آواز ہو کر پوچھا۔

''ارے بھئی، یہاں!'' عمار نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد اس نے بتایا کہ جب تماشائیوں نے ہنگامہ کیا تو میں جوکروں کے میک اَپ روم میں گیا تاکہ ان سے کہوں کہ فوراً رنگ میں پہنچیں کیوں کہ ایسے موقع پر کوئی مزاحیہ منظر ہی بپھرے

ہوئے ہجوم کو خاموش کر سکتا ہے..... مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس وقت مجھے یہ ترکیب سوجھی اور خود جوکر بن کر آ گیا۔

منیجر تارسکی نے اس کی پیٹھ ٹھونکی اور بولا: ''واہ بھئی! کمال کر دیا تم نے تو! میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں۔ تم نے تو سرکس کو بچا لیا ورنہ بپھرا ہوا ہجوم خبر نہیں کیا کرتا۔''

''شکریہ، مسٹر تارسکی کہ آپ نے میرے کام کو اتنا پسند کیا ورنہ میں نے کوئی اتنا بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا کہ جس کی اس قدر تعریف کی جائے۔''

''کام؟ اس کے لیے تو میں تمہیں ابھی جگہ دینے کو تیار ہوں۔'' تارسکی نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''کام تو فی الحال میرے پاس پہلے ہی موجود ہے۔'' عمار نے ہنس کر کہا۔ ''حالانکہ اس کام میں اب تک کچھ کامیابی نہیں ہوئی۔ آپ کو معلوم ہے، سابو کا گرنا کوئی حادثہ نہیں تھا۔ یہ تخریبی کارروائی کا نتیجہ تھا۔ تار کے ہک کو ریتی سے گھس دیا گیا تھا جو سابو کے ایک ہی جھٹکے سے ٹوٹ گیا۔'' عمار نے کہا۔

یہ سن کر منیجر کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا۔ ''اُف میرے خدا! وہ لڑکا ہوشیاری سے کام نہ لیتا تو اس کا مر جانا یقینی تھا۔ بہرحال، آپ دونوں اپنی کوششوں کو تیز کر دیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ جلد اس خبیث شخص کو بے نقاب کر دیں گے جو انسانی جانوں کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہے۔'' اتنا کہہ کر منیجر چلا گیا۔

''سرکس دل چسپ ہے، مگر ہمیں دیکھنا چاہیے کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔'' عامر نے عمار سے سرگوشی میں کہا۔ دونوں باہر نکلے تو سابو بھی ان کے ساتھ ہی چلا آیا۔ وہ کہنے لگا: ''ابھی میں فارغ ہوں۔ سوچا تمہارے ساتھ ہی چلوں۔ میں نے آج منیجر اور سوڈانی کی باتیں سنیں تو معلوم ہوا کہ تم دونوں کس لیے سرکس میں آئے ہو۔ مجھے اور جاکو کو اپنا دوست سمجھو۔ ہم بدمعاشوں کو پکڑنے میں تمہاری پوری پوری مدد کریں گے۔'' لڑکے اس کی باتوں پر حیران تو ہوئے اور قدرے گھبرائے بھی مگر اس کے انداز سے سچائی جھلکتی تھی، اس لیے انہوں نے اس کی باتوں پر اعتبار کر لیا اور اکٹھے آگے بڑھے۔

اِدھر اُدھر دیکھ بھال کرتے وہ آرگن کے کیبن کے آگے سے گزرے تو سابو نے کیبن کے دروازے پر لٹکا ہوا پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔ سامنے کپڑوں کا بکس پڑا تھا۔

''آؤ، دیکھیں۔ یہ کیسے کپڑے ہیں۔'' عمار نے کہا اور تینوں اندر چلے گئے اور بکس میں سے مختلف لباس اُٹھا کر دیکھنے لگے۔ عامر

نے ہینٹن یونی فارم اُٹھالی اور الٹ پلٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ بالکل نئی معلوم ہوتی تھی۔ بٹن بھی بہت مضبوطی سے لگے ہوئے تھے۔ جیبوں کو ٹٹولا تو وہ خالی تھیں۔ کالر پلٹ کر دیکھا تو شہر کے ایک مشہور درزی کا لیبل لگا ہوا تھا۔ عامر نے اسی وقت تہیہ کرلیا کہ وہ کل ہی جا کر اس ٹیلر سے بات کرے گا۔ وہ ابھی تلاشی میں مصروف تھے کہ ایک دم چونک اُٹھے۔

''تم کون ہو؟ کیا کر رہے ہو؟'' کسی نے ڈپٹ کر پوچھا۔ لڑکوں نے پلٹ کر دیکھا تو آرکن دروازے میں کھڑا تلوار لہرا رہا تھا۔ تینوں سہم کر پیچھے ہٹے تو اس نے تلوار بکس میں پھینکتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

''میں ذرا ری ہرسل کرنے نکلا تھا۔ یہاں آج پہلا دن ہے نا۔ شو ذرا ٹھاٹ کا ہونا چاہیے۔ ہاں، پچ...... آپ لوگ کیا ڈھونڈ رہے تھے؟'' اس نے سادگی سے پوچھا۔

''ذرا تمہاری یونی فارم دیکھ رہے تھے۔'' عمار بولا۔

''ٹھیک ہے، تم دیکھو۔ میں ذرا ری ہرسل کرلوں۔'' اور وہ زومبی والی یونی فارم اُٹھا کر پردے کے پیچھے چلا گیا۔

''اچھا! آرکن، ہم چلتے ہیں۔'' عمار نے کہا اور تینوں کیبن سے نکل آئے۔ جب وہ دوبارہ سرکس کے خیمے میں داخل ہوئے تو سوڈانی رنگ ماسٹر ہاتھیوں کے کرتب دکھا چکا تھا۔ یہ سرکس کا آخری آئٹم تھا اور لوگ جانے کے لیے اُٹھ رہے تھے۔ لڑکے بھی ایک طرف جا کر کھڑے ہوگئے۔ ہجوم بہت تھا۔ تقریباً سارا شہر ہی سرکس دیکھنے ٹوٹ پڑا تھا۔ عامر اور عمار اپنی ناکامی کے احساس سے پریشان سے ہوگئے تھے اور اسی کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔

''ہمارے راستے میں تو جیسے دیوار حائل ہوگئی ہے۔ اتنے دنوں سے ہم کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے۔ چھوٹے سے چھوٹا سراغ بھی نہیں پا سکے۔ آرکن کا اس معاملے سے دور کا واسطہ بھی نہیں لگتا۔ ماریانا کے خلاف بھی ثابت نہیں ہوسکا کہ وہ ناگ اس کی ملی بھگت سے نکالا گیا تھا۔'' عامر نے پریشان ہوکر کہا۔

''خبر نہیں، وہاں گرین ولا میں کیا ہو رہا ہے۔ ہم نے خوامخواہ اس مصیبت میں ہاتھ ڈالا۔ دونوں معاملے بہت ہی الجھے ہوئے ہیں۔'' عمار نے کہا۔

''اگر واقعی یہ دونوں لڑکے، سابو اور جاکو، مخلص ہیں تو ان سے کچھ کام لینا چاہیے۔ ہم واپس چلیں اور یہاں کا معاملہ ان پر چھوڑ جائیں۔ کوئی غیر معمولی واقعہ ہو تو یہ ہمیں فون کر سکتے ہیں۔'' عامر نے تجویز پیش کی۔ جاکو اور سابو سرکس کی چیزیں اُٹھوانے میں دوسرے ملازموں کی مدد کر رہے تھے۔ جب وہ فارغ ہوکر آئے تو عامر نے ان سے بات کر کے انہیں اعتماد میں لیا۔ وہ قابلِ اعتبار تھے۔ آئے دن کی وارداتوں کی وجہ سے انہیں سرکس کے مالک سے ہمدردی ہوگئی تھی۔ وہ فوراً آمادہ ہوگئے۔

''ہم سے جو کچھ بھی ہوسکا، ضرور کریں گے۔ تم ہمیں ہدایات دے دو۔ ہم ان پر عمل کریں گے۔'' جاکو نے وعدہ کیا۔

''ہم کان اور آنکھیں کھلی رکھیں گے اور ہر وقت مجرم کی تاک میں رہیں گے۔'' سابو نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

اگلے دن صبح ہی صبح عامر اور عمار گرین ولا روانہ ہوگئے۔ وہ ڈرائیو کی طرف مُڑے ہی تھے کہ اس طرف سے آتی ہوئی ایک گاڑی نے ان کا راستہ روک لیا۔ دونوں گاڑیاں آمنے سامنے کھڑی ہوگئیں۔ دوسری گاڑی کا دروازہ کھلا اور مسٹر ولیم نیچے اُترے۔ کھڑکی سے مسز ولیم سر نکال کر دیکھنے لگیں۔ انہیں دیکھ کر دونوں لڑکے اخلاقاً اپنی گاڑی سے اُترے اور خیریت پوچھی۔ مسٹر ولیم شرمندگی کے انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے کہنے لگے:

''بچو، میں بے حد شرمندہ ہوں کہ اس دن تم پر نہ صرف شبہ کیا بلکہ تمہیں خوامخواہ اپنے ہاں قید رکھا۔''

مسٹر ولیم کے معذرت کے انداز پر عمار کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اس نے کہا: ''آپ ہمیں شرمندہ کر رہے ہیں۔ ہمیں تو اس وقت ہی معلوم ہوگیا تھا کہ آپ کو ان لوگوں نے دھوکا دیا ہے۔ اسی لیے ہم موقع پا کر فرار ہوگئے۔ ورنہ وہ لوگ ہمیں اپنے قابو میں کر کے حالات کو زیادہ بگاڑ دیتے۔''

''مجھے تو سب کچھ بعد میں پولیس انسپکٹر نے بتایا کہ وہ لوگ کیوں تمہارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔'' مسٹر ولیم نے کہا۔

''اب تم کہاں جا رہے ہو؟'' مسز ولیم نے پوچھا۔

''جی، ہم امجد کے مکان تک جا رہے ہیں۔'' عامر نے جواب دیا۔

''وہاں کیا کرنے جاؤ گے؟ امجد تو ہے نہیں وہاں۔'' مسٹر ولیم نے کہا۔

''ہم ابھی تک جنگل میں آتش زدگی کے متعلق تحقیقات میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی سلسلے میں جانا ہے۔'' عامر نے جواب دیا۔

''نہیں، نہیں...... وہاں ہرگز نہ جانا۔ ہم ابھی ابھی اس بنگلے کے سامنے سے گزرے تھے اور ہم نے وہاں زومبی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' مسز ولیم نے خوف زدہ ہوکر کہا۔ (باقی آئندہ)

کالا ہرن

رانا محمد شاہد

کالا ہرن ...... آسام، مغربی بنگال اور کیرالہ کے جنوبی ساحل کے علاوہ ہندوستان کے تقریباً ہر حصے میں پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ یورپ، امریکہ اور افریقہ میں بھی پایا جاتا ہے۔ ان کا مسکن کھلے میدان ہیں۔ یہ جنگلوں اور پہاڑوں پر رہنے سے گریز کرتے ہیں۔

پاکستان میں ہرنوں کی متعدد اہم اقسام پائی جاتی ہیں۔ تاہم ان میں پاڑھ، چنکارا، کگرنافہ ہرن اور کالا ہرن ہی معروف ہیں۔ کالا ہرن اپنی خوب صورتی میں اپنی مثال آپ ہے۔ نوجوان کالے ہرن کی پشت بھورے رنگ کی ہوتی ہے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ رنگت میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کالے ہرن کی پشت کا اوپر والا حصہ، بازو، گردن، جزوی چہرہ اور ٹانگوں کا بیرونی حصہ سیاہ ہو جاتا ہے۔ یہ عموماً تین سال کی عمر میں سیاہ رنگت اختیار کرتا ہے۔

کالے ہرن کا وزن تقریباً چالیس کلوگرام ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں چمک دار اور روشن نظر آتی ہیں اور ان کے گرد سفید دھبے ہوتے ہیں۔ بڑے کان باہر کی طرف نکلے ہوتے ہیں۔ مادہ ہرن کا رنگ مشرقی مائل بھورا ہوتا ہے۔ پنجاب میں یہ نایاب جانور صحرائے چولستان جب کہ سندھ میں خیرپور اور تھرپارکر کے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ بہت سے علاقوں میں زیادہ شکار کرنے کی وجہ سے بھی اس کی نسل ناپید ہوتی جا رہی ہے۔

کالے ہرن کے سینگ اس کی خوب صورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہ سینگ لمبائی میں دو دو فٹ یا اس سے کچھ زیادہ بڑے ہوتے ہیں اور دیکھنے میں بہت بھلے لگتے ہیں۔ سینگ عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض نر ہرنوں میں یہ لچھے دار اور گول ہوتے ہیں جب کہ بعض کے سینگ لہریے دار ہوتے ہیں۔ نر سینگ عام طور پر ساڑھے انیس سے چوبیس انچ تک لمبے ہوتے ہیں جب کہ مادہ ہرن نازک ہوتا ہے۔ یہ بھورا اور سفید رنگ میں پایا جاتا ہے۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ اس کے سینگ نہیں ہوتے یا بہت ہی کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ کالا ہرن 20 فٹ تک لمبی چھلانگ لگا سکتا ہے۔ جب یہ دوڑتا ہے تو اس کی زیادہ سے زیادہ رفتار 65 میل فی گھنٹہ تک ہوتی ہے۔ یہ دُنیا میں زیادہ لمبی دوڑ کے لیے مشہور ہے۔ جیسے جیسے یہ دوڑتا ہے، اس کی دوڑ بڑی بڑی چھلانگوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ چھلانگوں کے درمیان تقریباً 20 فٹ تک کا فاصلہ ہوتا ہے اور یہ ایک انتہائی دلکش منظر ہوتا ہے۔

مادہ ہرن کی تعداد نر کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ ان کی

خوراک زیادہ تر عام گھاس، چھوٹے چھوٹے پودوں کی نرم کونپلیں، پتے، ان کی جڑیں اور جنگلی پھل ہوتے ہیں۔ کالے ہرن کو جگالی کرنے والا جانور بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی قوتِ برداشت کمال کی ہوتی ہے۔ بغیر پانی کے کافی دنوں تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ قوتِ مدافعت زیادہ ہونے کی وجہ سے جلدی بیماری کا شکار نہیں ہوتے۔ ان کی طبعی عمر 12 سے 15 سال کے درمیان ہوتی ہے۔ نر 3 سے 5 سال میں بالغ ہوتا ہے جبکہ مادہ کی بلوغت کا عرصہ دو سال ہے۔

یہ ذہانت میں بھی بہت آگے ہیں۔ اپنی حدود کا تعین بڑے ہی دل چسپ انداز میں کرتے ہیں۔ اپنے چہرے کو درختوں کے تنوں سے رگڑتے ہیں اور مخصوص بو پھیلاتے ہیں۔ یوں دوسرے غول کے ہرنوں کو پیغام دیتے ہیں کہ وہ ان کی حدود میں داخل نہ ہوں۔ ہری گھاس چونکہ ان کی مرغوب غذا ہے، اس لیے کھلے میدانوں میں صبح سے دوپہر تک چرتے نظر آتے ہیں۔ پھر تیز دھوپ میں آرام کرتے ہیں۔

کالے ہرن کے دشمنوں میں زیادہ تر سیاہ خرگوش، بھیڑیے اور گیدڑ ہیں۔ تاہم سب سے بڑا دشمن انسان ہے جو تفریح اور گوشت خوری کے لیے اس جانور کی نسل ختم کرتا چلا جا رہا ہے۔ یہ دشمن کی موجودگی کا پتا بھی بڑے دل چسپ انداز میں لگاتے ہیں۔ جب کسی ایک غول کے ہرنوں کو دشمن کا اندازہ ہو جاتا ہے تو ایک ہرن دوسرے کو آگاہ کرتا ہے اور دوسرا ہرن پیروں سے فضا میں چار فٹ تک اونچی چھلانگ لگاتا ہے۔ اس طریقے سے وہ جانور جو گروہ کا حصہ بن گئے تھے، چونک جاتے ہیں اور پھر وہاں سے فوری رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ موسم خراب ہو جائے یا طوفان باد و باراں آ جائے تو یہ دیہاتوں کا رُخ کرتے ہیں۔ پھر یہ کسی سائبان کی تلاش میں پناہ لیتے ہیں تو ان حالات میں یہ انسان سے بہت مانوس ہو جاتے ہیں۔

کالے ہرن کا گوشت بہت لذیذ ہوتا ہے جب کہ اس کی کھال سے مختلف اشیاء بنائی جاتی ہیں۔ اس کے سینگوں کو حنوط کر کے خوب صورتی کے لیے دیوان خانوں کی زینت بنایا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ گوشت، سینگ اور کھال کے حصول کے لیے اس کا بے دردی سے شکار کیا جاتا ہے جس سے اس خوب صورت جانور کی تعداد دن بدن گھٹتی جا رہی ہے۔ ان حالات میں اگر اس کا شکار روکنے کے لیے سخت اقدامات نہ اٹھائے گئے تو یہ جانور نایاب ہو جائے گا اور اس کی نسل ناپید۔ اس خوب صورت جانور کی حفاظت کے لیے متعدد محفوظ علاقے ہیں جن میں قابل ذکر لال سہانرا نیشنل پارک بہاول پور ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس جانور کی سائنسی، حیاتیاتی اور طبعی قدر و قیمت کو بھی محفوظ کیا جائے۔

☆☆☆

معلوماتِ عامہ

1- زعفران کا پھول (Crocus Flower) قدرتی تھرما میٹر ہے۔ یہ تب کھلتا ہے جب درجۂ حرارت 23 درجے سینٹی گریڈ ہوتا ہے اور درجۂ حرارت گرنے پر بند ہو جاتا ہے۔

2- گلاب کا پھول 32 ملین سال سے دُنیا میں خوب صورتی کی علامت بنا ہوا ہے۔

3- دُنیا میں پھولوں کی دو لاکھ پچاس ہزار (250,000) اقسام پائی جاتی ہیں۔

4- کُکروندا (Dandelion) پوٹاشیم، کیلشیم، آئرن، وٹامن اے اور وٹامن سی کا ذریعہ ہے۔ سبز کُکروندے ایک کپ 7000-13000 وٹامن سی کا ذریعہ ہوتا ہے۔

5- 2002ء میں سائنس دانوں نے دُنیا کا سب سے پرانا پھول چائنا میں دریافت کیا۔ لال پھول (Red Flower) ایک سو پچیس (125) ملین سال پہلے اُگنے والے واٹرلیلی سے ملتا ہے۔ اس پھول کو "Archaefructus Genus" میں شمار کیا جاتا ہے۔

(کشف طاہر، لاہور)

کون کیا تھا؟

☆ ابراہم لنکن ایک کسان کا بیٹا تھا، لیکن محنت کر کے امریکہ کا صدر بنا۔

☆ تھامس ایڈیسن اخبار فروش تھا لیکن محنت کر کے بڑا سائنس دان بنا۔

☆ ہٹلر میونخ میں تصویریں بناتا تھا۔ بچپن غربت میں گزارا مگر محنت کر کے جرمنی کا حکمران بن گیا۔

☆ نپولین ایک عام وکیل کا بیٹا تھا لیکن محنت اور ہمت سے فرانس کا حاکم بنا۔

☆ جوزف اسٹالین ایک موچی کا بیٹا تھا لیکن اپنی محنت اور لگن سے روس کا وزیراعظم بنا۔

☆ غلام اسحاق خان نائب تحصیل دار تھے لیکن محنت کر کے پاکستان کے صدر بنے۔

☆ احسان دانش اُردو کے معروف شاعر بنے۔ تمام عمر مزدوری کی، مگر مشہور و معروف شاعر کی حیثیت سے نام کمایا۔

☆ زمین کا وزن چھ ہزار ٹریلین ٹن ہے۔

☆ دُنیا کا پہلا نقشہ اناگر سیمنڈر (Anagar Symender) نے تیار کیا۔

☆ قطبی ستارہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔

☆ دُنیا گول ہے۔ یہ سب سے پہلے فیثا غورث (Pathy Gorus) نے معلوم کیا۔

(فتح محمد شارق، نوشہرہ)
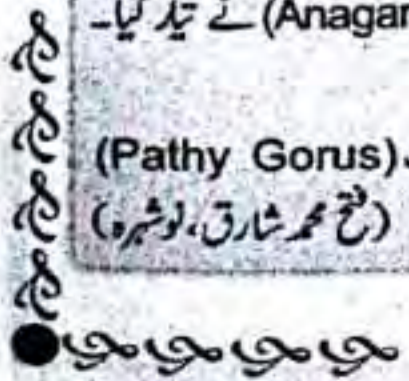
گ	ڈ	ب	ل	ر	و	ٹ	ی	س	م
ل	م	ء	س	ع	ل	ے	ث	ڑ	ل
ا	ک	ڑ	ی	ب	ا	چ	ر	ف	ی
ب	ظ	ش	ح	ق	م	پ	ٹ	غ	پ
ژ	ا	ن	ڈ	ہ	س	ا	و	خ	ٹ
ح	ل	ش	ے	پ	ض	ن	ی	ط	ا
ب	ی	ص	غ	م	ء	ی	پ	ذ	پ
ا	ت	خ	ر	د	ث	ل	م	ش	ن
ت	و	ط	گ	ث	ط	ض	ک	ز	ہ
ک	م	چ	ژ	خ	ی	ف	ل	ق	ڈ

آپ نے حروف ملا کر دس نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن الفاظ کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

چابی، کتاب، قلفی، پانی، ڈبل روٹی، لیپ ٹاپ، گلاب، کمپیوٹر، انڈہ، درخت

باپ (بیٹے سے): ''دیکھو بیٹا! میں تمہیں شریر لڑکوں کی صحبت سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔''

بیٹا (معصومیت سے): ''اسی لیے تو میں اسکول نہیں جاتا۔'' ☆

ایک دوست نے دوسرے دوست سے کہا: ''یہ ٹائی بہت خوب صورت ہے، کتنے میں لی ہے؟''

دوسرا دوست بولا: ''جب میں نے یہ ٹائی لی تھی، اس وقت دکان دار دکان پر نہیں تھا۔'' (مائرہ حنیف، بہاول پور)

بھکاری نے ایک گھر کے سامنے صدا لگائی۔ گھر کی نئی نویلی دلہن نے کہا: ''جاؤ بابا! معاف کرو۔'' بھکاری کچھ دور گیا تو دلہن کی ساس نے اسے آواز لگائی۔ بھکاری خوشی خوشی آیا تو خاتون نے بھی کہا۔

''جاؤ بابا! معاف کرو۔''

بھکاری کو بہت غصہ آیا۔ اس نے کہا: ''یہ بات تو آپ کی بہو نے بھی کہہ دی تھی، پھر مجھے واپس کیوں بلایا۔''

خاتون نے جواب دیا: ''مالکن میں ہوں، وہ کون ہوتی ہے تم پر رعب جمانے والی۔'' (محمد عثمان نفیس، گوجرانوالہ)

باپ (بیٹے سے) ''کمرے میں جا کر دیکھو، کلاک چل رہا ہے یا نہیں؟''

بیٹا: ''ابا جان! کلاک چل تو نہیں رہا، البتہ اپنی دُم ہلا رہا ہے۔'' ☆

احمد: ''کہاں جا رہے ہو؟''

علی (غصے سے): ''چڑیا گھر۔''

احمد: ''اپنے پنجرے کا نمبر تو بتاتے جاؤ۔'' (خدیجہ نعیم، لاہور)

ایک جنگل میں شیر کی شادی ہو رہی تھی۔ جب بارات جانے لگی تو اچانک ایک چوہا بارات کے آگے آگے ناچنے لگا۔ شیر نے پوچھا: ''بھئی تم کیوں ناچ رہے ہو؟ یہ کسی چوہے کی شادی تو نہیں ہے۔''

چوہے نے کہا: ''شادی سے پہلے میں بھی شیر ہوتا تھا۔'' (زل رانا، لاہور)

ارشد میاں حجامت بنوانے گئے۔ حجام نے پوچھا:

''میاں کتنی عمر ہے آپ کی؟''

ارشد: ''سات سال۔''

حجام: ''آپ بال کٹوائیں گے؟''

ارشد: ''تو اور کیا، تمہارا خیال ہے میں داڑھی منڈوانے آیا ہوں۔''

(احور کامران، لاہور)

مجسٹریٹ (چور سے): ''تمہیں چوری کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟''

چور: ''آتی ہے حضور!''

مجسٹریٹ: ''پھر؟''

چور: ''پھر چلی جاتی ہے حضور!'' ☆

ایک دفعہ ایک صاحب ساری رات سوچتے رہے کہ میں کراچی خط بھیجتا ہوں تو آٹھ روپے لگتے ہیں اور خود جاتا ہوں تو چار سو روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ کیوں نہ میں بھی ڈاک کے ذریعے پہنچ جاؤں۔

دوسرے دن صبح سویرے نہا دھو کر ڈاک خانے گیا۔ آٹھ روپے کا ٹکٹ خرید کر ماتھے پر لگایا اور ایک بڑا سا لیٹر بکس دیکھ کر اس میں سر ڈال دیا۔ جب ڈاکیا ڈاک نکالنے پہنچا تو اس نے خیال کیا کہ کوئی چور ہے جو ڈاک چوری کر رہا ہے۔ اس نے اپنا جوتا اتار کر مرمت شروع کر دی۔ وہ صاحب جب پانچ چھ جوتے کھا چکے تو چلا کر کہنے لگے: ''اب بس بھی کرو، ٹکٹ تو میں نے ایک ہی لگایا ہے اور مہریں تم اتنی لگائے جا رہے ہو۔'' (کظیمہ زہرہ، لاہور)

پہلا آدمی (دوسرے سے): ''عورت اور گھڑی میں کیا فرق ہے؟''

دوسرا آدمی: ''جب گھڑی بگڑتی ہے تو وہ خاموش ہو جاتی ہے لیکن جب عورت بگڑتی ہے تو محلہ سر پر اُٹھا لیتی ہے۔'' (عبدالمقیت، لاہور)

ایک دفعہ ایک شاعر اور شاعرہ کا آپس میں جھگڑا ہو گیا اور دونوں سڑک کے کنارے لڑنے لگے۔ لوگ انہیں پکڑ کر تھانیدار کے پاس لے گئے۔ جب تھانیدار نے ان سے وجہ پوچھی تو شاعرہ نے کہا۔

شاعرہ: ''اس نے مجھے جھنجھوڑا۔''

شاعر: ''اس نے میرا بازو مروڑا۔''

شاعرہ: ''غلط کہہ رہا ہے یہ گھوڑا۔''

شاعر: ''عورت ہے یا بندوق کا توڑا۔''

جب تھانیدار ان کی اس مختصر سی شاعری سے تنگ آ گیا تو بولا:

''جاؤ بھئی میں نے تم دونوں کو چھوڑا۔'' (محمد سلیم، فیصل آباد)

سر آئزک نیوٹن

جس نے زمین کی کشش کا راز معلوم کیا

آپ نے باغ میں کھیلتے ہوئے دیکھا ہوگا کہ آم درخت سے ٹپک کر سیدھا زمین پر گرتا ہے۔ اگر آپ کے ہاتھ سے پنسل چھوٹ جائے تو وہ بھی زمین پر گر پڑتی ہے۔ کبھی آپ نے سوچا کہ چیزیں زمین پر کیوں گرتی ہیں؟ آج سے تین سو سال پہلے ایک انگریز نے بھی اپنے آپ سے یہی سوال کیا تھا۔ وہ باغ میں ٹہل رہا تھا کہ ایک سیب درخت سے ٹوٹ کر زمین پر گرا اور وہ سوچنے لگا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ چیزیں زمین پر کیوں گرتی ہیں۔ تب اس نے یہ معلوم کیا کہ زمین میں ایک ایسی طاقت ہے جو ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس دریافت کی وجہ سے اس آدمی نے سائنس کی دنیا میں شہرت حاصل کر لی۔ یہ آدمی آئزک نیوٹن تھا۔

آئزک نیوٹن 1642ء میں انگلستان کے ایک قصبے ولز تھروپ میں پیدا ہوا۔ نیوٹن کا باپ ایک غریب کسان تھا۔ بچے کی پیدائش کے تین سال بعد اس کا باپ مر گیا۔ نیوٹن کی ماں نے دوسری شادی کر لی اور نیوٹن کو اس کی دادی کے پاس چھوڑ دیا۔ دادی نے یتیم پوتے کو بڑے لاڈ پیار سے پالا مگر اس کی تربیت کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ بارہ سال کی عمر میں آئزک نیوٹن اسکول میں داخل ہوا۔ اس کو پڑھنے لکھنے سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ وہ کلاس کے تمام لڑکوں سے کمزور اور دبلا پتلا تھا۔ اس لیے لڑکے ہر وقت اسے پریشان کرتے رہتے تھے۔ کمزور ہونے کی وجہ سے وہ ان شریر لڑکوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ آخر تنگ آ کر ایک روز اس نے سوچا میں طاقت میں ان لڑکوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور نہ ان سے لڑ سکتا ہوں پھر کیوں نہ میں ان کو پڑھائی میں شکست دوں۔ اس روز سے نیوٹن دل لگا کر پڑھنے لگا اور بہت جلد وہ اپنی کلاس میں سب سے ہوشیار طالب علم سمجھا جانے لگا۔

دو سال بعد نیوٹن کا سوتیلا باپ بھی مر گیا۔ نیوٹن کی ماں اکیلی تھی، اس نے کھیتوں کی دیکھ بھال کے لیے بیٹے کو اپنے پاس بلا لیا۔ نیوٹن اپنی ماں کے حکم سے اسکول چھوڑ کر چلا آیا لیکن اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ کھیت کا کام چھوڑ کر پھر اسکول میں داخل ہو جائے۔ نیوٹن کا ماموں کیمبرج کے ایک کالج کا ممبر تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ نیوٹن کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہے تو اس نے اپنی بہن کو سمجھایا اور نیوٹن کو پھر اسکول میں داخل کرا دیا۔ دو سال تک نیوٹن بڑی محنت سے پڑھتا رہا اور 1661ء میں ٹرینٹی کالج کیمبرج میں داخل ہو گیا۔

نیوٹن نے بہت جلد ریاضی میں غیر معمولی قابلیت حاصل کر لی۔ چار سال بعد وہ تعلیم سے فارغ ہوا تو اس کی قابلیت کا سکہ بیٹھ چکا تھا۔ کالج کے زمانے میں اس نے ریاضی کے دو نئے اصول دریافت کر لیے تھے۔

اسی زمانے میں نیوٹن نے زمین کی کشش کا اصول دریافت کیا۔ اس اصول کی وجہ سے اسے سائنس کی دنیا میں ایک اہم مقام حاصل ہو گیا کہا جاتا ہے کہ نیوٹن ایک روز باغ میں ٹہل رہا تھا۔ اس

کے سامنے ایک سیب شاخ سے ٹوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ نیوٹن نے اس بات سے یہ اندازہ لگایا کہ زمین کے اندر ایک ایسی طاقت ہے جو ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس طاقت کو اس نے کشش ارض کا نام دیا۔ بعد میں نیوٹن کئی سال تک اس نظریے پر تحقیقات کرتا رہا اور اس نے معلوم کیا کہ زمین، چاند، سورج اور تمام سیاروں میں یہ طاقت موجود ہے۔ اس طاقت کی وجہ سے چھوٹے سیارے بڑے سیاروں کے گرد گھومتے ہیں اور تمام سیارے ایک دوسرے کی کشش کی وجہ سے اپنے مقام پر قائم ہیں۔ اگر ان سیاروں میں یہ طاقت نہ ہوتو وہ ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں۔

نیوٹن نے 1665ء میں جس کالج سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی تھی چار سال بعد وہ اسی کالج میں ریاضی کا پروفیسر مقرر ہوگیا۔

اسی زمانے میں اس نے روشنی کے متعلق تحقیقات کی نیوٹن یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ روشنی کیا چیز ہے اور کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ اس وقت تک عام خیال یہی تھا کہ روشنی ایک طرح کا رنگ ہے جو بعض سیاروں اور دوسری چیزوں کی چمک سے پیدا ہوتا ہے۔ نیوٹن نے ثابت کیا کہ روشنی کوئی رنگ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ننھے ننھے ذرے ہیں جو چمک دار چیزوں اور سیاروں سے خارج ہو کر فضا میں پھیلتے رہتے ہیں۔ نیوٹن کی رائے تھی کہ روشنی ایک سیکنڈ میں نوے 90 ہزار میل فاصلہ طے کرتی ہے۔ لیکن بعد میں پتا چلا کہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔

روشنی کے متعلق اس تحقیقات میں نیوٹن نے دوربین سے کام لیا تھا۔ اس وقت تک دوربین اسی طریقے پر بنائی جاتی تھی جو گلیلو نے دریافت کیا تھا۔ نیوٹن نے روشنی کے متعلق اپنی تحقیقات کے ذریعے یہ معلوم کیا کہ بہت سے سیارے جو زیادہ فاصلے پر ہیں اس دوربین سے نظر نہیں آ سکتے۔ انہیں دیکھنے کے لیے کسی ایسے آلے کی ضرورت ہے جو ہلکی سے ہلکی روشنی کو بھی تیز کر دے۔ اس روشنی کی مدد سے یہ سیارے نظر آ جائیں گے۔ اس اصول پر نیوٹن نے ایک دوربین تیار کی۔ جس میں چمکیلے شیشے پر ستاروں کی روشنی پڑتی تھی۔ اس روشنی کو دوربین کے معمولی شیشوں کی مدد سے دیکھا جائے تو ایسے ستارے بھی نظر آنے لگتے ہیں جو عام دوربینوں سے نظر نہیں آتے تھے۔

آج کل ستاروں کو دیکھنے کے لیے جو دوربینیں استعمال کی جاتی ہیں۔ وہ نیوٹن کی بنائی ہوئی دوربین ہی کے اصول پر کام کرتی ہیں۔ اس دوربین کی ایجاد سے نیوٹن کی شہرت بڑھ گئی۔ دوسرے سائنس دان بھی اس کی تحقیقات میں دل چسپی لینے لگے۔ نیوٹن کی سائنسی خدمات کے اعتراف کے طور پر 1675ء میں اسے انگلستان کی رائل سوسائٹی کا فیلو منتخب کیا گیا۔

نیوٹن اب اپنے ملک کا ایک ممتاز سائنس دان سمجھا جانے لگا اس کی شہرت تمام یورپ میں پھیل چکی تھی لیکن اس کی مالی حالت اب بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ اس نے اپنی سائنسی تحقیقات کے متعلق ایک کتاب لکھی لیکن اس کے پاس اتنا روپیہ نہ تھا کہ وہ اسے شائع کرا سکتا۔ نیوٹن کے بعض دوستوں نے اس کی مدد کی اور 1685ء میں یہ کتاب شائع ہوگئی۔

1692ء میں نیوٹن سخت بیمار ہوگیا اور دو سال تک بیمار رہا۔ نیوٹن کے دوستوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کے لیے کوئی ایسی ملازمت تلاش کی جائے جس کے ذریعے وہ آرام سے زندگی گزار سکے۔ جب نیوٹن تندرست ہوگیا تو 1695ء میں اسے انگلستان کی شاہی ٹکسال کا وارڈن مقرر کردیا گیا۔ نیوٹن نے ٹکسال میں بڑی محنت اور خوبی سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ چار سال بعد اسے ترقی دے کر ٹکسال کا ماسٹر بنا دیا گیا جو ٹکسال کا سب سے بڑا عہدہ تھا۔

برطانوی قوم نے نیوٹن کا خدمات پر اسے بڑے بڑے اعزاز دیئے 1689ء میں اسے یونیورسٹی کی طرف سے پارلیمنٹ کا ممبر چنا گیا۔ 1705ء میں ملکہ نے کیمبرج کا دورہ کیا اور نیوٹن کو سر (نائٹ) کا خطاب دیا۔

اسی زمانے میں نیوٹن کو رائل سوسائٹی کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ یہ اعزاز اسے مرتے دم تک حاصل رہا۔ ٹکسال کا ماسٹر اور پارلیمنٹ کا ممبر مقرر ہونے کے بعد نیوٹن سائنسی تحقیقات جاری نہ رکھ سکا۔ لیکن رائل سوسائٹی کے صدر کی حیثیت سے وہ سائنس کے معاملات میں برابر دل چسپی لیتا رہا۔

20 مارچ 1727ء کو نیوٹن گردے کی بیماری سے انتقال کر گیا۔ اسے انگلستان کے شاہی قبرستان ویسٹ منسٹر ایبے میں دفن کیا گیا۔

یہ تھی اس غریب کسان کے بچے کی کہانی جسے بارہ سال تک اسکول میں داخل ہونے کا موقع بھی نہ ملا تھا۔ اس نے اپنی محنت اور کوشش سے شہرت اور عزت حاصل کی اور اپنی تحقیقات سے اپنی قوم اور تمام دنیا کو ایسے فائدے پہنچائے جنہیں انسان کبھی بھلا نہ سکے گا۔ ☆

کھجور کے بارے میں قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

ترجمہ: ''ہم نے اس (پانی کے ذریعے) تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغات اُگائے۔ ان میں تمہارے لیے بہت سے پھل ہیں اور انہی میں سے تم کھاتے ہو۔'' (المومنون19:23)

رسول اکرمؐ نے فرمایا: ''جس گھر میں کھجور ہو، اس گھر والے کبھی بھوکے نہ رہیں گے۔'' (مسلم شریف)

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رات کا کھانا ہرگز نہ چھوڑو خواہ ایک مٹھی کھجور ہی کھا لو، کیوں کہ رات کا کھانا چھوڑنے سے بڑھاپا طاری ہو جاتا ہے۔ نسائی شریف میں ہے، رسول کریمؐ نے فرمایا: ''جسے کھجور میسر ہو وہ اس سے روزہ افطار کرے، جسے نہ ملے وہ پانی سے کھول لے۔'' اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دن بھر کے فاقہ کے بعد توانائی کم ہو جاتی ہے، اس لیے افطاری ایسی چیز سے ہو جو جلد ہضم ہو جائے اور طاقت بھی دے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ کی سب سے زیادہ پسندیدہ کھجور عجوہ تھی۔ ابن حبان بخاری شریف ج 2 ص918 میں وارد ہے، حضرت عامر بن سعدؓ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ جو شخص صبح سات عجوہ کھجور کھائے گا، اس دن اسے کسی جادو یا زہر کا اثر نہ ہوگا۔ کھجور آنے پر آپ کو مسرت ہوتی تھی جو اس کے محبوب ہونے کی دلیل ہے۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا:

''جس گھر میں کھجور نہ ہو وہ گھر والے بھوکے ہیں۔''

کھجور کے درخت کو اکثر مذاہب میں مقدس مانا جاتا ہے۔ ہندو اسے درگاہ پوجا میں استعمال کرتے تھے۔ عیسائیوں میں Palm Sunday تہوار بھی کھجور پر منایا جاتا ہے۔

انجیل وتوریت میں ہے: ''تو تم پہلے دن خوش نما درختوں کے پھل اور کھجور کی ڈالیاں اور گھنے درختوں کی شاخیں اور بید مجنوں لینا اور تم خداوند اپنے خدا کے آگے سات دن تک خوشی مناؤ۔'' (احبار32:04)

توریت اور انجیل میں کھجور کا ذکر 84 مقامات پر آیا۔

کھجور دُنیا میں کھایا جانے والا سب سے اہم پھل ہے۔ یہ اپنے ذائقے اور اقسام کی بنا پر دُنیا بھر میں مقبول ہونے کے ساتھ ساتھ اکثر ممالک میں کاشت کیا جاتا ہے۔ کھجور عراق، سعودی عرب اور شمالی افریقہ سے لے کر مغربی مراکش تک ایک روایتی فصل کے طور پر کاشت کی جاتی ہے۔ قرآنِ پاک میں بارہا اس کا ذکر ہے۔ اکثر اسلامی ممالک میں کھجور اور دہی یا دودھ کو افطار کو بنیادی جزو سمجھا جاتا ہے۔ عیسائیوں اور یہودیوں میں بھی کھجور کا کافی اہمیت حاصل ہے۔

مشرقِ وسطیٰ میں ہزاروں برس سے کھجور کو بنیادی غذا کی حیثیت

حاصل ہے۔ مشرق وسطیٰ میں کھجور کی کاشت کا آغاز خلیج فارس سے ہوا اور میسوپوٹامیہ (موجودہ عراق) سے لے کر قبل از تاریخ کے مصر میں قدیم وقتوں سے اس کی کاشت ہو رہی ہے۔ آج مصر دُنیا بھر میں سب سے زیادہ کھجور پیدا کرنے والا ملک ہے۔ مشرقی عرب میں 4000 قبل مسیح سے کھجور کی کاشت کے شواہد بھی ملے ہیں۔

کھجور کے پودے کو کاشت کے سات سال بعد پھل لگنا شروع ہو جاتا ہے اور دس برس تک وہ ہر موسم میں 80 سے 120 کلو تک پھل دے سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی کاشت کا آغاز شمالی افریقہ کے صحرائی نخلستانوں اور غالباً جنوب مغربی ایشیا میں ہوا۔

کھجور کا پھل بیضوی شکل کا ہوتا ہے جس کی لمبائی تین سے سات سینٹی میٹر ہوتی ہے جب کہ اس کا قطر 2 سے 3 سینٹی میٹر ہوتا ہے۔ کچی کھجور کا رنگ اپنی قسم کے لحاظ سے سرخ یا شوخ زرد ہو سکتا ہے۔ کھجور میں 2.25 سینٹی میٹر لمبا بیج ہوتا ہے۔ پچاس فیصد سے زائد کھجوروں کی کاشت پھل دار پودوں سے پیوند کاری کر کے حاصل کی جاتی ہے۔ پیوند کاری یا تراش کر لگایا گیا پودا بیج سے لگائے گئے پودے کی نسبت دو تین برس پہلے بار آور ہو جاتا ہے۔ کھجور چار مراحل میں پکتی ہے۔ ان مراحل میں کچی کھجور اور خستہ کھجور کے علاوہ الرطب (نرم کی ہوئی)، تمر (پکنے کے بعد دھوپ میں سکھائی ہوئی)۔ غذائیت کے لحاظ سے سو گرام تازہ کھجور میں وٹامن سی وافر مقدار میں ہوتی ہے۔ اس سے 230 کیلوریز انرجی حاصل ہوتی ہے۔ چوں کہ کھجور میں پانی کی کچھ مقدار موجود ہوتی ہے، لہٰذا سوکھنے کے بعد بھی وہ خشک نہیں ہوتی، اگرچہ اس عمل میں وٹامن سی ضائع ہو جاتا ہے۔

کھجور عام طور پر اسی شکل میں کھائی جاتی ہے جب کہ اکثر اوقات اس کا بیج نکال کر اس میں بادام، مالٹے کی ٹافی، لیموں کا چھلکا یا پان ڈال دیا جاتا ہے۔ کھجور کو کاٹ کر یا پیس کر مختلف ذائقہ دار کھانوں میں بھی ڈالا جاتا ہے۔ بعض ممالک میں کھجور کے تازہ پتے پکا کر سبزی کے طور پر کھائے بھی جاتے ہیں۔ اس کے پسے ہوئے بیج آٹے میں ملا کر قحط سالی کے دنوں میں روٹی بھی بنائی جاتی ہے۔ ہندوستان، شمالی افریقہ اور گھانا میں کھجوروں کو پام شوگر (گڑ کی ایک قسم) بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور بعض ممالک اسے الکحل والے مشروبات میں بھی استعمال کر رہے ہیں۔

کھجور کے بیجوں کو صابن اور کاسمیٹکس میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ شمالی افریقہ میں کھجور کے پتوں سے جھونپڑے بنائے جاتے ہیں۔ کھجور کے سوکھے پتے چھتری یا جھاڑو بنانے اور ایندھن کے طور پر جلانے کے کام بھی آتے ہیں۔ ان کا ریشہ رسی، خام کپڑا اور بڑے ہیٹ بنانے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ کھجور کی لکڑی پلوں اور پانی کے نالوں کی تعمیر میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ عمان میں اس درخت کا ہر ایک حصہ رسی، ٹوکریاں، شکاری کشتیاں اور روایتی ہیٹ بنانے میں استعمال ہوتا ہے۔ مرہم، دوا، شربت اور لیپ کے طور پر اس کا استعمال گلے کی خراش، نزلہ، زکام، بخار اور بہت سی دیگر شکایات کے لیے بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ کھجور کے بیج کا پاؤڈر کئی روایتی ادویات میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ کھجور کے تنے سے نکلنے والا گوند نما مادہ ہندوستان کے کئی علاقوں میں ڈائریا اور مخصوص امراض کے علاج کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کی جڑیں دانت کے درد کے علاج میں کام آتی ہیں۔

کھجور کھانے کے فوائد اور احتیاطیں:

1- کھجور کے ساتھ کھیرا کھانے سے جسم توانا اور مضبوط ہوتا ہے۔

2- کھجور کو نہار منہ کھانا چاہیے۔

3- کھجور عمر میں اضافے کے ساتھ نظر کی کم زوری کو بڑی حد تک پوری کرتی ہے۔

4- قبض کی شکایت ہو تو کھجور کو ایک گلاس پانی میں رات بھر بھگو دیں اور صبح شربت بنا کر پی لیں۔

5- کھجور کے ساتھ مٹھی یا کشمش نہیں کھانی چاہیے۔

6- نیم پختہ کھجور کو پُرانی کھجور کے ساتھ ملا کر نہ کھائیں۔

7- ایک وقت میں 7 یا 8 دانے کھائیں بشرطیکہ مریض حال ہی میں بیماری سے نہ اُٹھا ہو۔

8- جس کی آنکھیں دُکھتی ہوں وہ کھجور نہ کھائیں۔

9- کھجور کے ساتھ تربوز کھانے سے تربوز کی ٹھنڈک سے کھجور کی گرمی دُور ہو جاتی ہے۔

10- دبلے پتلے لوگ کھجور کے ساتھ کھیرے کھائیں تو بہت جلد فربہ ہو جائیں گے۔

11- کھجور کے ساتھ انار کا پانی معدہ کی سوزش اور اسہال میں مفید ہے۔

☆☆☆
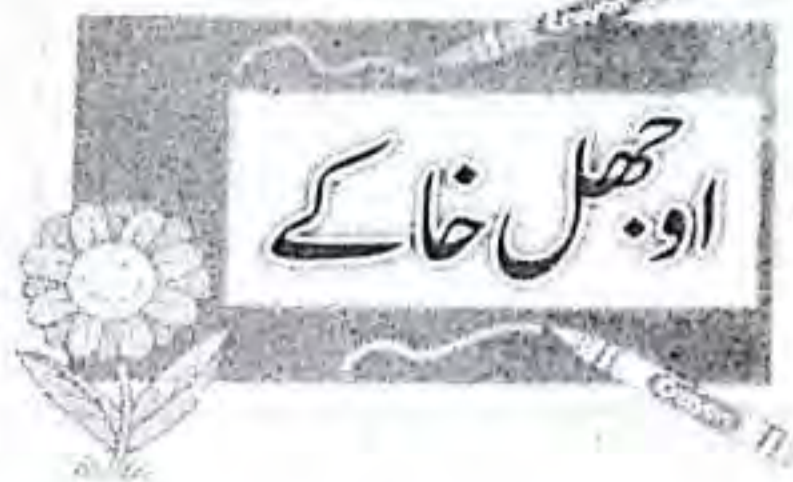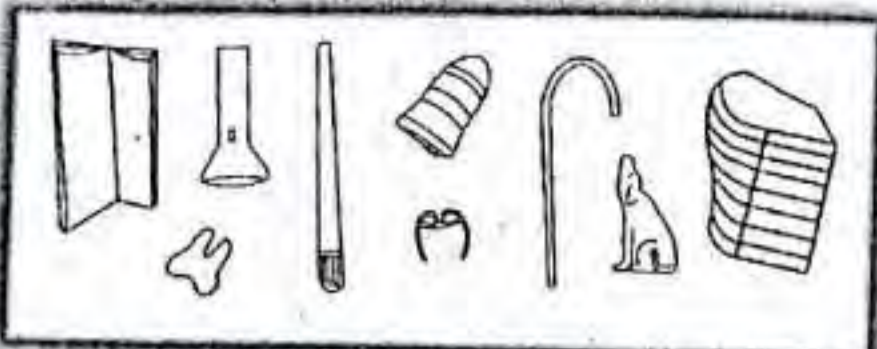
اوجھل خاکے
یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجئے اور شاباش لیجیے۔

دانتوں کو کس طرح برش کرنا چاہیے: برٹش ڈینٹل ہیلتھ فاؤنڈیشن نے دانتوں کو مناسب طریقے سے برش کرنے کے سلسلے میں مشورہ دیا ہے کہ برش کے سرے کو دانتوں پر رکھ کر اس کے ریشوں کو مسوڑھے کی لائن کے ساتھ 45 ڈگری زاویے سے ترچھا کریں۔ اس کے بعد برش کو چھوٹے گول دائروں کی صورت میں حرکت دیں۔ یہ حرکت ہر دانت کی سطح پر کئی مرتبہ ہونی چاہیے۔ ہر دانت کی بیرونی سطح پر بھی اوپر اور نیچے اس طرح برش کریں کہ ریشے مسوڑھوں کے ساتھ ترچھے رہیں۔ یہی طریقۂ کار اپنے تمام دانتوں کی اندرونی سطحوں کی صفائی کے لیے بھی اختیار کریں۔ چبانے والے دانتوں کی اوپری سطحوں کو برش کرنے پر خاص توجہ دیں۔ سامنے کے دانتوں کی اندرونی سطحوں کو صاف کرنے کے لیے برش کو عموداً ترچھا کریں اور برش کے سامنے والے حصے کو گول دائرے کی صورت میں حرکت دیں۔ دانتوں کو برش کرنے کے بعد اسی برش کے ریشے کو زبان کی سطح پر بھی رگڑیں۔ اس طرح منہ جراثیم سے زیادہ صاف ہو جائے گا اور سانس خوش گوار رہے گی۔

برٹش ڈینٹل ایسوسی ایشن ایسے ٹوتھ برش استعمال کرنے کی سفارش کرتی ہے جن کے سرے چھوٹے ہوں تاکہ وہ کونے کھدروں تک پہنچ سکے۔ زیادہ تر لوگوں کو میڈیم یا سافٹ ٹوتھ برش منتخب کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ دانتوں کے امراض کے ماہرین یہ بھی تاکید کرتے ہیں کہ برش کو اوپر نیچے رگڑنے کے بجائے اس کے ریشوں کو گول دائرے کی صورت میں دانتوں پر گھمانا چاہیے اور منہ کے پچھلے حصے تک برش کو لے جانا چاہیے جہاں جراثیم جمع ہو سکتے ہیں۔ دانتوں کو روزانہ دن میں دو مرتبہ کم از کم دو منٹ تک صاف کرنا چاہیے۔ ٹوتھ پیسٹ میں فلورائیڈ شامل ہونا چاہیے اور اس کی مقدار 1350ppm ہونی چاہیے۔ مشہور و معروف برانڈز کے ٹوتھ پیسٹ میں عموماً فلورائیڈ کی اتنی مقدار شامل ہوتی ہے۔ ہر دو تین ماہ بعد نیا ٹوتھ برش استعمال کرنا چاہیے۔ مخصوص دھاگے کی مدد سے دانتوں کے درمیان فلاسنگ بھی بہت ضروری ہے تاکہ ان میں پھنسے ہوئے غذائی ذرات اور میل کچیل نکل سکے جو صرف برش کرنے سے نہیں نکلتے۔

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 نومبر 2015ء ہے۔

کھوج لگائیے

نام: ____________

شہر: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 نومبر 2015ء ہے۔

دماغ لڑاؤ

نام: ____________

مقام: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

نومبر کا موضوع "مزار اقبال" ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 نومبر 2015ء ہے۔

ہونہار مصور

نام ____________ عمر ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ____________ شہر ____________

مقاصد ____________

موبائل نمبر: ____________

رومیسہ اشرف، حویلی لکھا

میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

علی عیش، گڑھا موڑ

میں ڈاکٹر بن کر اپنے ملک کا نام روشن کروں گا۔

ملک عالمگیر آصف، لاہور

میں آرمی افسر بن کر ملک کی حفاظت کروں گا۔

قاسم شاہ، ملکہ ہانس

الینا قیصر، راولپنڈی

میں بڑی ہو کر پائلٹ بنوں گی اور ملک کی خدمت کروں گی۔

حائقہ کامران، راولپنڈی

میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

کشف طاہر، لاہور

میں فضائی افسر بن کر پاکستانی سرحدوں کی حفاظت کروں گی۔

رانیم سلطان، جہلم

میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

محمد احسان، لاہور

میں فوجی بن کر ملک کی خدمت کروں گا۔

حنظلہ عمران، لاہور

میں ڈاکٹر بن کر بھی انسانیت کی خدمت کروں گا۔

مہد حسن، بھکر

میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گا اور ملک وقوم کی خدمت کروں گا۔

محمد ابراہیم، ملتان

میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا علاج کم فیس لے کر کروں گا۔

مومنہ شہزاد، راولپنڈی

میں آرمی آفیسر بنوں گی۔

فیصل مقصود، بہاولپور

میں فوج میں جاؤں گا اور دہشت گردی کا خاتمہ کروں گا۔

معاویہ صالح، رحیم یار خان

میں سیاست دان بنوں گا۔

نمرہ فاطمہ، راولپنڈی

میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی۔

محمد سعد، صوابی

میں لوگوں کی خدمت کروں گا۔

سید محمد عثمان، گوجرانوالہ

میں فوجی بن کر ملک وقوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

عون علی، لاہور

میں ڈاکٹر بن کر ملک وقوم کے لیے فخر کا باعث بنوں گا۔

حمدِ باری تعالیٰ

صبا کی چھیڑ خانی میں چھپا ہے
وہ چشموں کی روانی میں چھپا ہے
گل تازہ میں ہے خوشبو کی صورت
چمن ہے وہ رنگ و بو کی صورت
وہ خالق اور مالک ہے جہاں کا
وہ صانع ہے زمین و آسمان کا
وہ معبود ہے جن و بشر کا
وہ خالق ہے یقیناً بحر و بر کا
وہ چاہے تو چلیں ٹھنڈی ہوائیں
اسی کے حکم سے برسیں گھٹائیں
وہ ظاہر اور باطن جانتا ہے
وہ ہر ذی نفس کو پہچانتا ہے
گلوں کو تازگی دیتا وہی ہے
قمر کو روشنی دیتا وہی ہے

(ریاض حسین قمر، منگلا ڈیم)

غرور و تکبر

خلیفہ منصور عباسی کی ناک پر ایک مکھی بار بار بیٹھتی۔ وہ بار بار ہٹاتے۔ آخر جھنجھلا کر کہنے لگے۔ ''اللہ نے اس ذلیل مکھی کو کیوں پیدا کیا۔'' ایک عالم باعمل شیخ ابن سلمان پاس بیٹھے تھے بول اُٹھے۔ ''متکبر کا غرور توڑنے کے لیے۔'' (مائرہ حنیف، بہاول پور)

انتہا

کسی نے علامہ اقبال سے پوچھا۔ ''عقل کی انتہا کیا ہے؟'' جواب ملا۔ ''حیرت۔'' پھر پوچھا گیا۔ ''حیرت کی انتہا؟'' جواب ملا۔ ''عشق۔'' ''عشق کی انتہا کیا ہے؟'' فرمایا۔ ''عشق لا انتہا ہے۔ اس کی کوئی انتہا نہیں۔'' سوال کرنے والے نے کہا۔ ''لیکن آپ نے تو لکھا ہے۔ ''تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں۔'' آپ نے مسکرا کر کہا۔ دوسرے مصرعے میں اپنی غلطی کا اعتراف بھی کیا کہ ''میری سادگی دیکھ میں کیا چاہتا ہوں۔'' (کشف طاہر، لاہور)

عقیدتِ قرآن

والد کے عقیدت مندوں میں ایک حجازی عرب بھی تھے جو کبھی کبھار آتے اور انہیں قرآن مجید پڑھ کر سنایا کرتے۔ میں نے بھی ان سے کچھ عرصہ کے لیے قرآن مجید پڑھا ہے۔ وہ بے حد خوش الحان تھے۔ والد جب بھی ان سے قرآن مجید سنتے، مجھے بلوا بھیجتے اور اپنے پاس بٹھا لیتے۔ ایک بار انہوں نے سورۃ مزمل کی تلاوت کی تو آپ اتنا روئے کہ تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ جب وہ ختم کر چکے تو آپ نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور مرتعش لہجے میں بولے: ''تمہیں یوں قرآن پڑھنا چاہیے۔'' اسی طرح مجھے ایک بار مسدس حالی پڑھنے کو کہا اور خاص طور پر وہ بند...... جب قریب بیٹھے ہوئے میاں محمد شفیع نے دہرایا: ''وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا''
تو آپ سنتے ہی آبدیدہ ہو گئے۔ میں نے انہیں والدہ کی موت پر آنسو بہاتے نہ دیکھا تھا مگر قرآن مجید سنتے وقت یا اپنا کوئی شعر پڑھتے وقت یا رسول اللہؐ کا اسمِ مبارک کسی کی نوکِ زبان پر آتے ہی ان کی آنکھیں بھر آیا کرتیں۔ (از ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال فرزندِ اقبالؒ)

(زُل کامران، لاہور)

دعا کے بارے میں ہدایات

☆ دعا کرنے سے پہلے آپؐ پر درود بھیجنا چاہیے۔
☆ دعا کرنے کے بعد آمین کہنا چاہیے۔
☆ ہتھیلیاں اوپر کر کے دعا کرنا اور بعد میں ہاتھوں کو منہ پر پھیرنا۔
☆ دعا کر کے اس کی قبولیت کے لیے جلد بازی نہ کرنا۔
☆ دعا کرنے والے کا حرام آمدنی سے پرہیز کرنا۔
☆ یقین رکھنا کہ دعا کسی بھی صورت میں ضرور قبول ہو گی۔
☆ امن و عافیت کے دنوں میں بکثرت دعا کرنا۔
☆ عزم سے دعا کرنا۔

(عبدالرحمٰن، راول پنڈی)

اقوالِ زریں

☆ جو اُستاد کی سختیاں نہیں جھیلتا، اسے لوگوں کی سختیاں جھیلنا پڑتی ہیں۔

☆ زندگی ایک ایسا امتحان ہے جس کی کوئی تاریخ مقرر نہیں ہے۔
☆ سچے دوست کا ساتھ مت چھوڑو، خواہ وہ تمہیں چھوڑ جائے۔
☆ جو دوسروں کا گلا تمہارے ساتھ کرتا ہے، یقیناً وہ آپ کا گلا دوسروں سے کرتا ہوگا۔
☆ باپ کی قدر کرو تا کہ اللہ تعالیٰ تجھے دُنیا میں بلند کر دے۔
☆ خاموشی سب سے آسان کام اور سب سے فائدہ مند ہے۔

(حافظہ مہدیہ آصف، وزیر آباد)

عقل وحکمت

عقل وحکمت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے:

☆ نظر نیچی رکھنا۔
☆ زبان کو بے محل نہ کھولنا۔
☆ حلال غذا کھانا۔
☆ سچ بولنا۔
☆ عہد پورا کرنا۔
☆ مہمان کی عزت کرنا۔
☆ پڑوسی کی مدد کرنا۔
☆ جس بات سے فائدہ نہ ہو، اسے ترک کر دینا۔ (خولہ ضیاء، لاہور)

سچے موتی

☆ روزِ محشر پہلے جو مقدمہ پیش ہوگا، وہ دو پڑوسی ہوں گے۔
☆ ماں باپ کی دعائیں لو، ہمیشہ پھولوں کی طرح مہکتے رہو گے۔
☆ سچائی کا مقابلہ دُنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔
☆ جس چیز کی ضرورت نہیں، اس کی جستجو مت کرو۔
☆ ٹھوکر لگنے سے پہلے جو ہوشیار ہو جائے، وہ کامیاب ہے۔

(میمونہ، ڈیرہ اسماعیل خان)

زندہ رُود

زندہ رُود (دریا) مرکزی ایران کا ایک اہم دریا ہے جو اصفہان سے 90 میل مغرب سے نکلتا ہے اور شہر سے گزرتا ہوا 300 میل تک بہتا چلا گیا ہے۔ یزد سے مغرب کی طرف 75 میل تک دلدلی علاقہ ہے۔ "جاوید نامہ" میں اقبال نے اپنے لیے جو کردار تجویز کیا، اس کا نام "زندہ رُود" رکھا، یعنی اس سے دُنیا تاب وتوانائی حاصل کرتی ہے۔ جیسے زندہ رُود سے زمینیں پھلتی پھولتی ہیں اور زندگی کے نادر جوہروں میں اضافے کا موجب بنتی ہیں۔ (احور کامران، لاہور)

وہ بھی حکمران تھے

مصر وشام کا حکمران نور الدین زنگی اتنا بڑا انسان تھا کہ صلاح الدین ایوبی میں اس کے کردار کا ایک پرتو پایا جاتا ہے۔ صلاح الدین ایوبی نے اپنے کردار اور شخصیت کی تعمیر نور الدین زنگی ہی کی صحبت اور سرپرستی میں کی اور اسی کے نقشِ قدم پر چلنے کو اپنے لیے وجہِ افتخار جانا۔ نور الدین زنگی شاہی خزانے سے اپنے لیے ایک پیسہ بھی نہ لیتا تھا۔ اس کی گزر اوقات مالِ غنیمت یا اپنے کسی کام کی اجرت پر ہوتی تھی۔ گھر میں تنگی ترشی رہتی، جس کی وجہ سے بیوی اس سے تنگ آ چکی تھی۔ ایک دن اس نے شوہر سے کہا۔ "مصر اور شام کا علاقہ تمہارے زیرِ نگیں ہے اور تمہارے گھر کا یہ عالم ہے کہ اس میں آسودگی کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔"

نور الدین نے تحمل سے جواب دیا۔ "بیگم! خزانہ عوام کا ہے اور مجھے اس کی چوکیداری پر متعین کیا گیا ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں تمہاری خوشی اور گھر کی آسودگی کے لیے خیانت اور بددیانتی کر کے اپنے لیے جہنم میں ٹھکانا بنا لوں؟"

بیوی نے شرمندہ ہو کر منہ پھیر لیا اور دیر تک ندامت سے آنسو بہاتی رہی۔ (کظیمہ زہرہ، لاہور)

"خراب ہے......"

کھانے کو مل رہا ہے جو کھانا خراب ہے
اس واسطے تو حال تمہارا خراب ہے
کہتے ہیں جب گوالے سے "پتلا ہے دودھ کیوں"
کہتا ہے ہم سے "بھینس کا چارہ خراب ہے"
کرنے لگا علاج مرا جب سے ڈاکٹر
پہلے سے میرا حال زیادہ خراب ہے
ایسا کوئی نہیں جو کہے میں ہوں خود خراب
ہر کوئی کہہ رہا ہے کہ زمانہ خراب ہے
ہر چند حال ہی میں بنایا گیا ہے وہ
پھر بھی ہمارے گاؤں کا رستہ خراب ہے
دو ایک ہی مشین کے پُرزے نہیں خراب
اب تو نیاز آوے کا آوا خراب ہے

(فصیح اللہ اختر، واہ کینٹ)

مولٹین لاوا کیک

اجزاء:

براؤن شوگر: ایک سو پچاس گرام　مکھن: ایک سو پچاس گرام　انڈے: پانچ عدد　کوکو پاؤڈر: دو کھانے کے چمچ
چاکلیٹ سوس: تین کھانے کے چمچ　میدہ: ایک سو پچاس گرام　چاکلیٹ بار: آدھا کلو　ونیلا آئس کریم: ایک پیکٹ
چیری: دس عدد

ترکیب:

ایک پیالے میں مکھن اور براؤن شوگر کو اچھی طرح سات منٹ تک بیٹ کر لیں۔ پھر اس میں ایک ایک کر کے انڈے ڈال کر بیٹ کرتے جائیں۔ پھر اس میں کوکو پاؤڈر اور چاکلیٹ سوس ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ اب اس میں میدہ ڈال کر مکس کر لیں۔ اس کے بعد کپس میں چاکلیٹ بار اور انڈوں والے مکسچر کو ڈال کر اوون میں ایک سو میں ڈگری سینٹی گریڈ پر دس منٹ کے لیے بیک کر لیں۔ پھر ونیلا آئس کریم اور چیری سے گارنش کر کے سرو کریں۔

نو بیک چاکلیٹ کیک

اجزاء:

پلین چاکلیٹ: تین سو گرام (کدوکش کی ہوئی)　مکھن: پانچ اونس　کنڈینسڈ ملک: ایک ٹن　ڈائجسٹو بسکٹ: ایک سو دس گرام

ترکیب:

لوف ٹن کو بٹر پیپر کے ساتھ لائن کر لیں۔ پلین چاکلیٹ کو مائیکرو ویو میں ایک منٹ کے لیے پگھلائیں اور اسے مکھن میں شامل کر کے مکس کریں، یہاں تک کہ وہ پگھل جائے۔ پھر اس میں کنڈینسڈ ملک ڈال کر مکس کریں۔ اب اس مکسچر کا ایک چوتھائی حصہ بیس پر ڈال کر ڈائجسٹو بسکٹ میں سے تھوڑے بسکٹ ڈالیں۔ پھر دوبارہ چاکلیٹ کا مکسچر ڈال کر باقی بچے بسکٹس ڈال دیں۔ اب اس پر چاکلیٹ کا مکسچر ڈال کر پلاسٹک لپیٹ دیں اور دو گھنٹے کے لیے فریج میں سیٹ ہونے دیں۔ آخر میں اس کے ٹکڑے کاٹ کر سرو کریں۔

چاکلیٹ سوئس رول

اجزاء:

انڈے: تین عدد　کاسٹر شوگر: 75 گرام　میدہ: 50 گرام　کوکو پاؤڈر: 25 گرام

فلنگ کے لیے:

مکھن: 75 گرام　آئسنگ شوگر: 125 گرام　کدوکش چاکلیٹ: گارنش کے لیے

ترکیب:

ایک بڑے پیالے کو اُبلتے ہوئے پانی پر رکھیں۔ اس میں 3 عدد انڈے اور 75 گرام کاسٹر شوگر ڈال کر 5 سے 10 منٹ تک اچھی طرح مکس کرتے رہیں۔ کریمی ہو جائے تو چولہے سے ہٹا لیں۔ اس میں 50 گرام میدہ اور 25 گرام کوکو پاؤڈر ڈال کر فولڈ کریں۔ اب اس آمیزے کو ایک گریس کیے اور بٹر پیپر لگے بیکنگ ٹن میں ڈال دیں۔ پھر 200 ڈگری سینٹی گریڈ پر 10 منٹ بیک کر لیں۔ پھر اسے کسی کپڑے سے ڈھک کر رکھ دیں اور ٹھنڈا ہونے دیں۔ پھر بیکنگ ٹن سے نکال کر اس پر تھوڑا سا کوکو پاؤڈر چھڑک دیں۔ بٹر پیپر کو بھی آہستہ سے نکال دیں۔ فلنگ کے لیے ایک پیالے میں 75 گرام مکھن ڈال کر بیٹ کریں۔ یہ کریمی سا ہو جائے تو اس میں تھوڑی تھوڑی کر کے 125 گرام آئسنگ شوگر شامل کر دیں۔ اب اس فلنگ کو اسپنج پر پھیلا دیں۔ اب اسے ایک گریس پروف پیپر کے ساتھ فولڈ کر کے فریج میں رکھ دیں۔ جم جائے تو کدوکش چاکلیٹ چھڑکیں اور کریم سے گارنش کر لیں۔

بچوں کا انسائیکلو پیڈیا

حضرت امام حسینؓ

حضرت امام حسینؓ نواسۂ رسول ﷺ ہیں۔ آپؓ کے والد کا نام ''علیؓ'' اور ماں کا نام ''فاطمۃ الزاہرہؓ'' ہے۔ آپؓ، حضرت امام
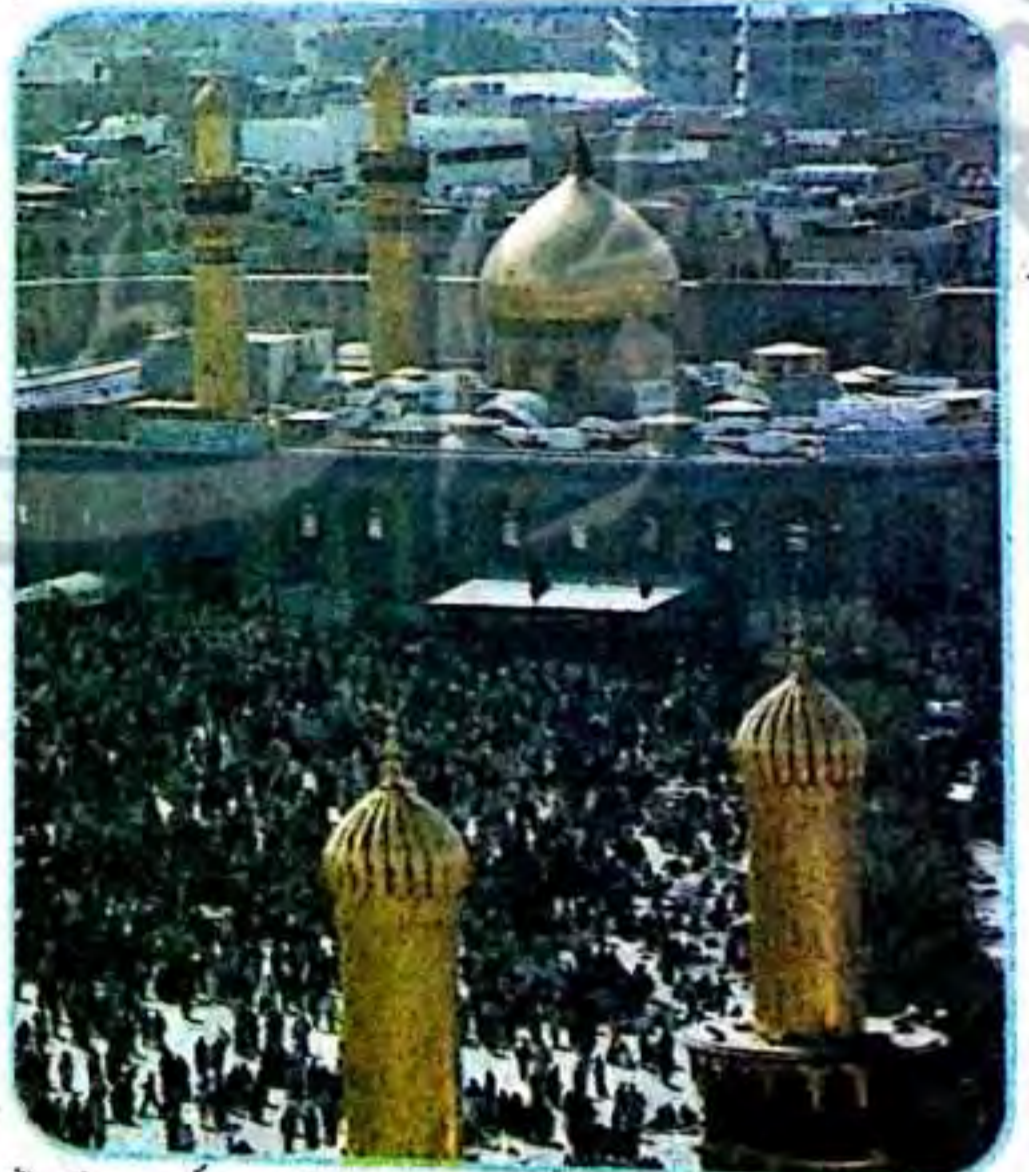
حسنؓ اور حضرت زینبؓ و حضرت عباس علمدارؓ کے بھائی ہیں۔ آپؓ 3 اور 4 شعبان کے درمیان 4 سن ہجری بمطابق 8 یا 10 جنوری 626ء کو مدینہ میں پیدا ہوئے، جب کہ آپؓ کی شہادت 10 محرم الحرام 61 سن ہجری بمطابق 10 اکتوبر 680ء کو ہوئی۔ آپؓ دنیا کی واحد ہستی ہیں جن کی شہادت کا دن پوری دُنیا میں منایا جاتا ہے۔ آپؓ کے یومِ شہادت کو ''عاشورہ'' کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہے محرم کا 10 واں دن۔ حضرت محمد ﷺ نے آپؓ کے لیے فرمایا تھا کہ حسینؓ مجھ سے ہے اور میں حسینؓ سے ہوں۔ یزید کی فوج سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ آپؓ کا مزار عراق کے شہر کربلا میں ہے۔ یزیدی فوج کے ایک جنگجو شمر نے آپؓ کا سر مبارک حالتِ نماز میں قلم کیا۔ آپؓ کے خاندان نے بھوک پیاس برداشت کی لیکن ظالم کے سامنے سر نہ جھکایا۔

آج آپؓ کا روضہ آپ کی شہادت کے مقام پر قائم ہے۔ مختار ابن ابوعبیدہ ثقفی نے مسجد کے ساتھ روضۂ حسینؓ پر گنبد اور دو داخلی دروازے تعمیر کروائے۔ روضہ کے پاس وسطی مینار ہے جس پر سونے کا پترا چڑھا ہے، جب کہ گنبد پر سونے و چاندی کا کام ہوا ہے۔ ہر سال لاکھوں مسلمان روضۂ امام حسینؓ پر حاضری دیتے ہیں۔ اب اس روضہ کے کئی داخلی دروازے ہیں۔

پولینڈ کا پرچم

پولینڈ مشرقی یورپ کا ملک ہے جس کا دارالحکومت ''وارسا'' (Warsa) ہے۔ یہ ملک کئی پڑوسی ممالک کے زیرِ اثر رہنے کے بعد موجودہ ریاست کی شکل میں 11 نومبر 1918ء کو دُنیا کے نقشے

پر اُبھرا۔ اس ملک کے پرچم میں دو برابر چوڑائی والی پٹیاں ہیں۔ اوپر والی دھاری کا رنگ سفید اور نچلی دھاری کا رنگ سرخ ہے۔ یہ

دونوں رنگ پولینڈ کے قومی رنگ بھی ہیں۔ یکم اگست 1919ء کو باضابطہ طور پر موجودہ جھنڈے کا استعمال شروع ہوا۔ 1931ء میں سفید و سرخ رنگ کو قومی رنگ کا درجہ ملا۔ 2004ء سے ہر سال 2 مئی کو "Flag Day" منایا جاتا ہے۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ انڈونیشیا اور مناکو (Monaco)، ان دونوں ممالک کے جھنڈے بھی سرخ و سفید دھاریاں رکھتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ان ممالک کے جھنڈوں میں سرخ دھاری اوپر کی طرف ہے۔

جاپانی پھل

جاپانی پھل (Persimmon) کا سائنسی نام "Diospyros" ہے جس کی متعدد انواع (Species) ہیں، جن میں "Diospyras Kaki" سب سے زیادہ کھائی جانے والی قسم ہے۔ موسم خزاں میں یہ پھل مارکیٹ میں آ جاتا ہے۔ یہ پھل جاپان، چین، برما اور شمالی بھارت کے درختوں کا ہے۔ اس کا خاندان "Ebenaceae" ہے۔ پھل کا رنگ ہلکا پیلا نارنجی یا

سرخ مائل نارنجی ہوتا ہے۔ جو قطر (Diameter) میں 1.5 سینٹی میٹر سے 9 سینٹی میٹر (0.5 سے 4 انچ) کے ہوتے ہیں۔ پھل پکنے سے پہلے تلخ یا کڑوا ذائقہ رکھتا ہے۔ پکا ہوا پھل شیریں و گلوکوز سے پُر ہوتا ہے۔ اس میں پروٹینز کم ہوتی ہیں۔ وٹامن اے، بی، سی، ای اور وٹامن کے (K) پائے جاتے ہیں۔ یہ پھل کیلشیم، آئرن، میگنیشیم، میگنیز، فاسفورس، پوٹاشیم، سوڈیم اور زنک کا خزانہ ہے۔ FAO (اقوام متحدہ) کے مطابق چین، جاپان، کوریا، برازیل اور آذربائی جان، جاپانی پھل پیدا کرنے والے بڑے ممالک ہیں۔ جاپانی پھل کی پیداوار میں پاکستان 8 واں بڑا ملک ہے، جب کہ بھارت 13 ویں نمبر پر ہے۔

طناب بازی

رسی پھلانگنے کو طناب بازی یا جمپ روپ (Jump Rope) بھی کہا جاتا ہے۔ اس کھیل کو عربی میں ''نط الحبل'' کہا جاتا ہے۔ یہ سادہ سا کھیل ہے جس میں کھیلنے والا ایک ڈوری یا رسی (Rope) کو دونوں ہاتھوں میں لے کر گھماتا ہے اور اُچھل کر رسی

کو نیچے سے گزارتا ہے۔ اگر اس دوران رسی پاؤں یا ٹانگ میں الجھ یا پھنس جائے تو کھلاڑی کی باری ختم ہو جاتی ہے۔ یہ بچوں اور جوانوں کا کھیل ہے۔ جو کھلاڑی جتنی بار رسی پھلانگ لیتا ہے، وہ چیمپئن یا فاتح قرار پاتا ہے۔ کبھی کبھار بڑی رسی لے کر دو کھلاڑی اسے گھماتے ہیں، جب کہ دو تین کھلاڑی درمیان میں آ کر جمپ کرتے ہیں۔ طناب بازی ایک ایکسرسائز بھی ہے۔ 15 سے 20 منٹ کا یہ کھیل کھیلنے سے شوگر کنٹرول ہوتی ہے۔ دل کے دورے کا امکان کم ہو جاتا ہے اور پیٹ بڑا نہیں ہوتا۔ امریکہ اور چین میں اس کھیل کے قومی سطح پر مقابلے ہوتے ہیں۔ ان ممالک میں جمپ روپ فیڈریشنز قائم ہیں۔

☆☆☆

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں
(مائرہ حنیف، بہاول پور)

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

☆

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آسان کر کے چھوڑوں گا
(ایمان زہرہ، لاہور)

یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

☆

اب تو گھبرا کر یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟
(رومیسہ زینب، راول پنڈی)

وہ قوم اس روز جلا دے گی کشتیاں
ہر فرد جو رکھتا ہو جذبوں میں اضطراب

☆

نجانے کون ہے جو کاتبِ تقدیر ہے سب کا
غریبوں کا مقدر تو امیر شہر لکھتا ہے
(عمرانہ عنبرین، پشاور)

بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام تیرا دیس ہے، تو مصطفوی ہے
(کشف طاہر، لاہور)

داغ سجود اگر تیری پیشانی پر ہوا تو کیا
کوئی ایسا سجدہ بھی کر کہ زمیں پر نشاں رہیں
(محمد احمد خان غوری، بہاول پور)

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا
(وشمہ خان، لاہور)

ہمارا خوں بھی شامل ہے تزئین گلستاں میں
ہمیں بھی یاد رکھنا چمن میں جب بہار آئے
(مقدس چوہدری، راول پنڈی)

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
(فاطمہ نور، شیخوپورہ)

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی
(مثیرہ سلمان بٹ، گوجرانوالہ)

میں بلبلِ نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں، محتاج کو داتا دے
(زینب محمود، جہلم)

ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کے
اس ملک کو رکھنا میرے بچو سنبھال کے
(سبیکا حاجرہ ڈوگر، فیصل آباد)

حالات بدلنے میں دیر کتنی لگتی ہے
خزاں کے ٹلنے میں دیر کتنی لگتی ہے
کھل گئے خوشیوں کے پھول میری دھرتی پر
خون سیراب ہونے میں دیر کتنی لگتی ہے
(محمد حفظ الرحمٰن فاروقی، ڈیرہ اسماعیل خان)

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے
(مسز محمد اکرم صدیقی، ہرنولی)

☆☆☆

بڑے میاں سو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ

اسلم بٹ صاحب بڑے نازک مزاج آدمی تھے۔ پیاز کی بدبو سے انہیں سخت چڑ تھی، حتیٰ کہ دسترخوان پر پیاز کی سلاد رکھی ہوتی تو اُٹھ کر چلے جاتے اور اپنا کھانا الگ کمرے میں منگوا لیتے۔ ایک روز وہ دفتر سے جلدی واپس آ گئے۔ ملازم ابھی ان کا دوپہر کا کھانا لے کر دفتر جانے ہی والا تھا کہ واپس آ کر بیگم صاحبہ سے کہنے لگا:

"بڑے میاں صاحب خود ہی آ گئے ہیں۔"

اب بیگم نے یہ سوچ کر کہ میاں تو دوپہر کے کھانے پر ہوں گے نہیں، خوب بہت سی پیاز کی سلاد بنا کر دسترخوان پر رکھی تھی۔ میاں صاحب جوں ہی کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے، پیاز کی تیز بُو سے چکرا کر سر پکڑ لیا۔

"اُف توبہ ہے! کس چیز کے بنے ہوئے ہو تم لوگ؟ کیسے کھاتے ہو یہ بدبودار چیز؟" یہ کہتے ہوئے چیختے چنگھاڑتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور گھر کے لوگوں کے لیے بھی کھانا کھانا حرام کر دیا۔ گھر میں بڑی بدمزگی ہو گئی۔ شام کو ان کا بیٹا ٹیوشن پڑھ کر آیا تو کمرے میں آتے ہی کچھ ایسا چکرایا کہ سلام تک کرنا بھول گیا اور ایک دم چلایا:

"اُف اللہ! توبہ ہے یہ کس بلا کی بُو سے کمرا بھرا پڑا ہے؟ آپ لوگوں کی ناک بند ہیں کیا؟"

"بیٹا کیا ہو گیا؟ یہ امرود ہیں میز پر اور تو کچھ نہیں ہے۔" ماں نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ کب کے باسی امرود سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں؟ دماغ پھٹ گیا بدبُو سے!" ماں کو بے حد غصہ آیا، وہ ڈپٹ کر بولیں:

"ہائے ہائے! کھانے کی چیز کی باس کو بدبُو کہتے ہو، توبہ کرو۔"

"توبہ توبہ ہی کر رہا ہوں اور حیران ہوں کہ آپ سب یہاں کیسے بیٹھے ہوئے ہو؟ توبہ! توبہ!" بیٹے نے جواب دیا۔

"حد ہے، باپ بیٹے کا دماغ اتنا نازک ہے...... ایک وہ بڑے میاں صاحب کو دیکھو، اور اوپر سے یہ چھوٹے میاں، سبحان اللہ!!" پاس ہی ان کی بیٹی بیٹھی تھی۔ تالی بجا کر ہنستے ہوئے بولی:

"واہ جی واہ! امی نے یہ خوب کہا...... بڑے میاں تو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ۔" بس پھر کیا تھا، سب بچوں نے یہ فقرہ سُر تال کے ساتھ تالیاں بجا بجا کر دُہرانا شروع کر دیا۔

دُنیا کی سب سے بڑی لائبریری

دُنیا کی سب سے بڑی لائبریری ''لائبریری آف کانگریس'' ہے جو امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی میں ہے۔ یہ لائبریری 1800ء میں 5000 ڈالرز کی لاگت سے قائم ہوئی۔ 1814ء میں برطانوی فوجوں نے امریکہ پر حملے کے دوران بڑی تباہی مچائی اور اس علاقے میں آگ لگا دی جس سے یہ لائبریری اور اس کی 3000 کتابیں جل گئیں۔ امریکہ کی آزادی کے بعد اس کے ایک صدر تھامس جیفرسن نے اپنی ذاتی لائبریری کی ساری کتابوں کا عطیہ دے کر ایک نئی لائبریری شروع کی۔ جیفرسن کے پاس 6487 کتابیں تھیں جو اس نے 25,950 ڈالرز خرچ کر کے پچاس سال کے طویل عرصے میں جمع کی تھیں۔ پہلے یہ اسی جگہ تھی جہاں جیفرسن کی ذاتی لائبریری تھی۔ کچھ عرصے بعد لائبریری کے لیے نئی عمارت بنائی گئی اور اس کا نام لائبریری آف کانگریس رکھا گیا۔

اس لائبریری میں ایک سو اٹھائیس ملین کتابیں، پُرانے مسودات، نقشے، رسائل اور فوٹو وغیرہ ہیں۔ صرف کتابوں کی تعداد انتیس ملین ہے۔ ان کتابوں اور مسودات کی تعداد میں ہر روز 10,000 کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ لائبریری کی ساری چیزیں رکھنے کے لیے الماریوں کی لمبائی 530 میل ہے۔ عمارت میں تہ خانے کے علاوہ چار مزید منزلیں ہیں۔ اس لائبریری میں 470 زبانوں کی کتابیں ہیں۔ اس کا رابطہ دُنیا کی تمام بڑی لائبریریوں سے ہے۔ آپ یہاں دُنیا کی کسی زبان کی اور کہیں بھی موجود کتاب منگوا سکتے ہیں۔

لائبریری آف کانگریس کے مجموعے میں بہت سی نایاب کتابیں اور قدیم نسخے ہیں۔ اس میں پندرہویں صدی میں امریکہ میں چھپنے والی سب سے پُرانی کتاب The Bay Paslm کا نسخہ موجود ہے۔ یہاں کی سب سے چھوٹی کتاب کا نام Old King Cole ہے جو "1/25 x "1/25 سائز کی ہے۔ اس کے صفحات کو سوئی سے کھولا جاتا ہے۔ سب سے بڑی کتاب Birds of America ہے جو "39.37 (ایک میٹر) اُونچی ہے۔ سب سے پُرانی تحریر گوتم بدھ کے زمانے کا ایک پارچہ ہے جو 770 قبل مسیح میں لکھا گیا تھا۔ اس سے بھی پُرانا لکھا ہوا مواد cunciform tablets پر ہے۔ یہ 2024 قبل مسیح میں تحریر ہوا تھا۔ لائبریری میں موجود سب سے پُرانا اخبار Mercurius Publicas کی وہ کاپی ہے جو 29 دسمبر 1659ء کو چھپی تھی۔

☆☆☆

اَلصَّبُوْرُ جَلَّ جَلالُہٗ
(بڑا بردبار)

اَلصَّبُوْرُ جَلَّ جَلالُہٗ اپنے گناہ گار بندوں کو سزا دینے میں جلدی نہیں فرماتے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں اور بندیوں سے بہت محبت فرماتے ہیں۔ نافرمانی ہو جائے تو وہ فوراً سزا نہیں دیتے بلکہ اپنے بندوں کی توبہ کا انتظار کرتے ہیں۔ جو بھی اس سے معافی مانگے تو معافی کے ساتھ استقبال کرتے ہیں۔

"اَلصَّبُوْرُ" کا لفظ صبر سے بنا ہے۔ جب کوئی مصیبت آ جائے تو اس پر صبر کرنا، کیوں کہ اس دُنیا میں تکلیف اور آرام، دکھ سکھ، خوشی غم، کام یابی ناکامی آتی رہتی ہے۔ ان چیزوں پر صبر کرنا اسے بہت پسند ہے۔ صبر کرنے والوں کے ساتھ اللہ کی مدد ہوتی ہے۔ کسی تکلیف پر صبر کرنا بغیر حساب کے ثواب دلاتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس کا مفہوم ہے:

"اگر کسی کو کوئی رنج پہنچا اور اس پر اس نے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے صبر کر لیا تو اس صبر پر اسے ثواب تو ملے گا ہی۔ اللہ تعالیٰ اسے جنت عطا فرمائیں گے۔"

طائف کی وادی اور......

تنزیل کب سے الماری میں کسی کتاب کو تلاش کر رہا تھا۔

"پتا نہیں کہاں ہے؟" وہ جھنجھلا کر کہہ اُٹھتا۔

"بیٹا! کیا تلاش کر رہے ہو؟" امی نے پوچھا۔

"امی! محمد بن قاسم کے بارے میں اُستاذِ محترم نے ایک مضمون لکھنے کے لیے دیا ہے۔ محمد بن قاسم کی معلومات والی کتاب تلاش کر رہا ہوں۔"

"وہ کتاب سمیرا کے پاس ہے۔" یہ سنتے ہی وہ آگ بگولہ ہو گیا اور بے تحاشا بہن سے جھگڑنے لگا۔ "جہاں سے کتاب اُٹھاتی ہو، استعمال کے بعد وہاں نہیں رکھ سکتی۔" اس جھگڑے پر سمیرا نے دو دن تک تنزیل سے بات نہ کی تھی۔

"بیٹا! کتنا مضمون باقی ہے؟"

"امی! ابھی آدھا مضمون ہوا ہے۔ اُمید ہے کہ دو دن میں مکمل ہو جائے گا۔"

"بیٹا! آپ کو معلوم ہے کہ محمد بن قاسم کے آباء و اجداد کہاں کے تھے؟" اس نے انکار میں سر ہلایا۔

امی سے تنزیل، محمد بن قاسم کے بارے میں معلوماتی بات بڑے غور سے سننے لگا:

"حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کو دین کی تبلیغ فرماتے۔ مکہ کے لوگ آپ کو بہت تکلیف پہنچاتے، جب تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا جناب ابو طالب زندہ تھے تو وہ آپ کی مدد

کرتے، مگران کے انتقال کے بعد مکہ کے کافر بہت زیادہ تکلیف دینے لگے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم طائف تشریف لے گئے کہ وہاں ایک قبیلہ ہے جس کا نام ''ثقیف'' تھا۔ یہ بہت بڑا قبیلہ تھا۔ اگر یہ قبیلہ مسلمان ہو جائے تو مسلمانوں کو تکلیفوں سے نجات مل جائے اور دین پھیلنے کی بنیاد پڑ جائے۔

وہاں تین سردار تھے، مگر انہوں نے کوئی بات نہیں سنی اور بہت بُرا سلوک کیا اور شہر کے لڑکے پیچھے لگا دیئے اور آپؐ کو بہت پتھر مارے اور آپؐ کو لہولہان کر دیا آپؐ کو چھ میل تک یہ لڑکے پتھر مارتے رہے اور آپؐ برداشت کرتے رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اسی حالت میں ایک جگہ رُکے۔ جب سب لڑکے واپس چلے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی:

''اے اللہ! میں تجھ سے ہی اپنی کم زوری کی فریاد کرتا ہوں۔ تو ہی ضعیفوں کا رب ہے۔'' بہت دیر تک دعا مانگتے رہے۔ آپؐ نے طائف والوں کے لیے کوئی بددعا نہیں فرمائی۔ ایک فرشتہ حاضر ہو گیا اور سلام عرض کرنے کے بعد کہا: ''اگر حکم فرمائیں تو دونوں طرف کے پہاڑوں کو ملا دوں جس سے یہ سارے طائف والے کچل جائیں اور سرمے کی طرح پس جائیں۔''

مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس تکلیف پر صبر فرمایا اور اس صبر والے نبیؐ نے جواب دیا کہ: ''اگر یہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے تو ان کی اولاد میں سے ایسے لوگ ہوں گے جو مسلمان ہوں گے۔''

چناں چہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صبر کا ہی نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے محمد بن قاسم کو پیدا فرمایا۔ محمد بن قاسم طائف والوں کی اولاد میں سے ہیں۔ سندھ کو ''باب الاسلام'' (اسلام کا دروازہ) کہتے ہیں۔ محمد بن قاسم کی وجہ سے آج پاکستان میں اسلام کی بہار ہے۔ محمد بن قاسم کا وجود ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صبر کا نتیجہ ہے۔ ورنہ وہ سارے لوگ کچل کر ختم کر دیئے جاتے۔

سمیرا سے جھگڑ کر تم نے بھی بے صبری دکھائی ہے۔ آپ بہن کو پیار سے بھی تو سمجھا سکتے تھے۔ اس طرح پیار سے سمجھانے سے وہ سمجھ جاتی اور آئندہ کتاب پڑھ کر وہیں اپنی جگہ پر رکھتی۔ جاؤ! اب جا کر اس سے معافی مانگو اور اس سے صلح کرو۔'' یہ سن کر وہ بے اختیار مسکرا اُٹھا۔

''جی امی! مجھ سے غلطی ہوئی۔'' وہ سمیرا کی طرف معذرت کرنے کے لیے بڑھا مگر سمیرا نے اسے پہلے ہی معاف کر دیا۔

شکر اور صبر

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے اور کسی تکلیف آ جانے پر صبر کی یہ دعا مانگیے، تاکہ اللہ تعالیٰ ہمیں شکر کرنے والوں اور صبر کرنے والوں میں سے بنا دے۔

''اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ شَکُوْرًا وَّاجْعَلْنِیْ صَبُوْرًا.''

ترجمہ: ''اے اللہ! مجھے بہت شکر کرنے والا اور اچھے طریقے سے صبر کرنے والا بنائیے۔''

یاد رکھنے کی باتیں

1- اللہ تعالیٰ نہ کرے کوئی تکلیف یا مصیبت آ جائے تو اس تکلیف پر بے صبری نہ دکھائیں، بلکہ صبر کریں اور اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کو سوچیں جو اس نے ہمیں دے رکھی ہیں، تو پھر صبر آ جائے گا۔

2- اللہ تعالیٰ دُنیا کی مصیبتوں اور پریشانیوں کے بدلے آخرت میں بلند درجے عطا فرماتے ہیں۔ اگر کانٹا بھی چبھ جائے تو اس پر ثواب ملتا ہے۔

3- اپنے سے نیچے والوں کو دیکھیں جن کے پاس وہ نعمتیں نہ ہوں جو ہمارے پاس ہیں، اس طرح اللہ تعالیٰ کا شکر ادا ہوگا۔

مسجد میں نماز ادا کرنے کی فضیلت

حضرت انس بن مالکؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آدمی کی نماز اپنے گھر میں ایک ہی نماز کے برابر اور قبیلہ یا محلّے کی مسجد میں 25 نمازوں کے برابر اور اس مسجد میں جہاں جمعہ کی نماز ہوتی ہے۔ 100 نمازوں کے برابر اور میری مسجد (مسجدِ نبویؐ) میں 50 ہزار نمازوں کے برابر اور مسجدِ حرام میں ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔

☆☆☆

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص جماعت کے لیے مسجد کی طرف چلے تو اس کا ایک قدم ایک گناہ مٹا دیتا ہے اور ایک قدم اس کے لیے نیکی لکھتا ہے، جاتے میں بھی اور لوٹتے میں بھی۔

شیخ ریاض بہت بڑے بزنس مین تھے۔ وہ ایک معروف کاروباری شخصیت تھے۔ شہر میں ان کی دولت کے بہت چرچے تھے۔ شیخ صاحب کے بیوی بچے سردیوں کی چھٹیاں گزارنے مری گئے ہوئے تھے۔ گھر میں وہ اکیلے تھے، صرف نوکر چاکر گھر میں ساتھ تھے۔ گارڈ گیٹ پر ڈیوٹی دیتا تھا۔ چوں کہ شیخ صاحب کے اہل و اعیال گھر پر نہیں تھے، لہٰذا ڈرائیور ایک دن پہلے چھٹی لے کر گاؤں چلا گیا تھا۔

حادثاتی طور پر دوسرے دن اچانک شیخ صاحب اپنے کمرے میں مردہ پائے گئے۔ پولیس تفتیشی آفیسر عمران کو جب اطلاع ملی تو وہ موقع واردات پر پہنچ گئے۔ انہوں نے نہایت باریک بینی سے تفتیش کی۔ گھر میں موجود ملازموں کی ایک فہرست بنائی۔ تمام ملازموں کے پورے دن بلکہ ایک ہفتے کے کام کاج اور اوقات کار معلوم کیے۔ شیخ صاحب کی لاش کا بھی بغور معائنہ کیا۔ پولیس آفیسر عمران نے لاش کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی کان کی بالی دیکھی، جیسے شیخ صاحب کی قاتل سے ہاتھا پائی بھی ہوئی تھی۔ اگلے دن انہوں نے تمام نوکروں کو حاضر کیا۔ ڈرائیور کو بھی گاؤں سے بلوا لیا گیا۔ سب سے پوچھ گچھ ہوئی لیکن کسی نے بھی اعتراف جرم نہیں کیا۔ پولیس آفیسر کو ڈرائیور پر کچھ شک گزرا تو اس سے مزید تفتیش شروع کی۔ اس کے حلیے کو غور سے دیکھا۔ ڈرائیور نے پگڑی کی شکل میں سر پر سفید کپڑا باندھ رکھا تھا۔ پگڑی کانوں کی لوؤں تک تھی۔ کان کی لوؤں کے قریب سفید پگڑی پر ہلکا سا خون کا دھبہ تھا۔

پیارے بچو! بتایئے پولیس آفیسر عمران نے قاتل کا سراغ کیسے لگایا؟ ہمیں جواب لکھ کر بھیجئے اور انعام پایئے۔

اکتوبر میں شائع ہونے والے ''کھوج لگایئے'' کا صحیح جواب یہ ہے:

پہاڑوں پر وہیل چیئر کے پہیوں کے نشان سے قاتل کا سراغ لگایا گیا، یعنی قاتل وہیل چیئر پر تھا۔

اکتوبر 2015ء کے کھوج لگایئے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

1- علی عیش، گڑھا موڑ، وہاڑی
2- محمد احسن جہانگیر، راول پنڈی
3- عائشہ احسن، راول پنڈی
4- زائش خورشید، ایبٹ آباد
5- معقد خان، کراچی

اس کے شوق کو پورا خاندان ناپسند کرتا تھا، مگر اسے تو فلمیں دیکھنے کا جنون تھا۔ آٹھویں جماعت کا طالب علم اور یہ لچھن، ابا اکثر اسے ڈانٹتے، مگر اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ اب تک وہ سینکڑوں فلمیں دیکھ چکا تھا۔ دوست بھی اس نے اپنے جیسے ہی ڈھونڈ لیے تھے۔ اپنے ہم جماعت لڑکوں سے جب وہ کسی فلم کی بات کرتا تو زیادہ تر لڑکے اسے بتاتے کہ ان کے والدین فلم دیکھنے سے منع کرتے ہیں لیکن وہ یقین نہیں کرتا تھا۔ بھلا آج کے دور میں کون ہے جو فلم نہیں دیکھتا؟ اس کی زبان پر ہر وقت فلموں کی باتیں، فلمی گانے یا فلمی کرداروں کے نام ہوتے، دیکھا جائے تو موجودہ زمانے میں فلمی اداکار ہی وہ شخصیت ہوتے ہیں جنہیں سب سے زیادہ شہرت ملتی ہے۔ عوام ان کی دیوانی ہوتی ہے، ان کے بالوں کے انداز اپنا لیے جاتے ہیں۔ ان کے جیسے کپڑے پہنے جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض افراد تو ان ہی کی طرح بولنے اور چلنے لگتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں یاسر بھی تھا۔ اسے پڑوسی ملک کا شاہ رخ خان بہت پسند تھا۔ اس کی فلم دیکھے بغیر اسے رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ بھی اپنے بالوں کو اپنے پسندیدہ ہیرو کی طرح بناتا، مگر کسی طور بھی اس کی شکل شاہ رخ سے نہیں ملتی تھی۔ اس کے بھائی بہن کہتے کہ تم ہمارے بھائی ہو، لہٰذا تمہاری صورت ہم سے ملتی ہے شاہ رخ خان سے نہیں، تو وہ چڑ کے رہ جاتا۔

صرف اسی پر موقوف نہیں تھا، یاسر اپنے پسندیدہ اداکار کو ہر خوشی کے موقع پر تہنیتی کارڈ بھی بھیجا کرتا۔ اس کی سالگرہ کا بے چینی سے منتظر رہتا، خصوصی کارڈ ڈیزائن کر کے اسے ڈاک سے روانہ کر دیتا۔ انٹرنیٹ پر اس نے شاہ رخ خان فین پیج بنا کر اسے خراجِ تحسین پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک دن صبح بستر سے اُٹھتے ہوئے اس نے انگڑائی لی اور بولا، فلاں فلم میں شاہ رخ سو کر اُٹھنے کے بعد ایسے انگڑائی لیتا ہے، تو اماں نے قریب رکھا بیلٹ اُٹھا کر اسے کھینچ مارا تھا۔ وہ اکثر اس پر دعائیں پڑھ کے پھونکتی رہتیں۔

اب تک سینکڑوں کارڈ شاہ رخ کو مل چکے تھے۔ اسے بھی یاسر کا نام یاد ہو گیا تھا۔ عید، بقرعید کے علاوہ بھی کئی بار اس کی فون پر بات ہوئی تھی۔ جس دن شاہ رخ نے اسے اسکائپ پہ رُوبرو بات کر کے اپنے گھر آنے کی دعوت دی، پھر تو نہ پوچھیے، مارے خوشی کے وہ دو راتوں تک سو نہ سکا۔ اماں سمجھاتیں، ارے اس نے تمہارا دل رکھنے کو کہہ دیا ہوگا، ورنہ ان جیسے لوگوں کے پاس وقت نہیں ہوتا۔

اس کے اس جنون سے گھر والے بھی پریشان ہو چکے تھے کہ ان کا بیٹا جانے کن رستوں پر چل نکلا ہے۔ ابا اسے سمجھاتے، جن کو لوگ آئیڈیل بناتے ہیں جب ان سے ملاقات ہو جائے تو بعض

اوقات نہایت مایوسی ہوتی ہے۔ پسندیدہ شخص کی بہت سی باتیں بہت بُری لگتی ہیں۔ جانے آج کے بچوں کو کیا ہو گیا ہے۔ ٹیپو سلطان، محمد بن قاسم، صلاح الدین ایوبی، راشد منہاس، میجر عزیز بھٹی بننے کی بجائے، سلمان خان، شاہ رخ خان، منا بھائی ایم بی بی ایس اور نہ جانے کیا کیا بننا چاہتے ہیں۔ کوئی دل چسپی نہیں ہے عبدالقدیر خان سے۔ ابا ناراض ہونے لگتے۔ اس پر بھلا ابا کی باتوں کا کیا اثر ہوتا، وہ کوئی شاہ رخ تھوڑا ہی تھے کہ ان کے ہر جملے یاد کیے بغیر ہی ازبر ہو جاتے۔

جس سے عقیدت ہو، اس سے ملاقات بھی ہو ہی جاتی ہے۔ یاسر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس کی زندگی میں ایک انتہائی اہم دن آنے والا تھا۔ ہوا یوں کہ تایا جو پڑوسی ملک میں رہتے تھے، اچانک شدید بیمار ہو گئے۔ رشتہ داروں نے ابا سے کہا کہ تمہارے بھائی کا اللہ میاں کے ہاں سے بلاوا آنے والا ہے۔ آ کر مل لو، تمہیں یاد کرتے ہیں۔ ابا نے جھٹ پٹ تیاری کی۔ جان پہچان والوں سے بات کر کے ایمرجنسی ویزا لگوایا اور یاسر کو ساتھ لے کر سفر پر روانہ ہو گئے۔ اس طرح یاسر میاں بھارت پہنچ گئے۔

ایئرپورٹ سے ہی انہوں نے فیس بک پر اپنے پہنچنے کے پیغامات بھیجے شروع کر دیئے۔ شاہ رخ سے وقت مانگا تاکہ ملاقات ہو سکے۔ ٹیلی فون کیے، مگر وقت مل ہی نہیں رہا تھا۔ اداکار کا معاون ان کی مصروفیات کا بتا کر رابطہ منقطع کر دیتا۔

گیارہ دن گزر چکے تھے، اب یاسر پریشان رہنے لگا۔ اسے اپنے آنے کا مقصد فوت ہوتا محسوس ہوا۔ اس نے اداکار کے معاون کی بہت منت سماجت کی کہ وہ بہت دور سے طویل سفر طے کر کے آیا ہے، برائے مہربانی اسے وقت دیا جائے، وہ شاہ رخ کی دعوت پر ہی آیا ہے۔ تب کہیں جا کر اس کی درخواست قبول ہوئی، تیرہویں دن اسے ملاقات کا وقت دے دیا گیا۔

پانچ گھنٹے ریل میں گزارنے کے بعد وہ اپنی پسندیدہ شخصیت کے گھر کی جانب جانے والی سڑک پر کھڑا تھا۔ وہاں تو عجیب ہی منظر تھا، لوگوں کا ایک جمِ غفیر تھا جنھیں محافظ سنبھال رہے تھے۔ وہاں جا کر اسے معلوم ہوا کہ لوگ تین تین دن انتظار کے بعد اپنی آنکھوں سے ہیرو کی ایک جھلک دیکھ پاتے ہیں، وہ بھی اس وقت جب وہ گھر سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھتا ہے۔

اسے مایوسی ہونے لگی۔ وہ وقت جسے اس نے ہمیشہ ضائع کیا، یک دم بہت بیش قیمت لگنے لگا۔ وہ مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ایک محافظ کو بتایا کہ اس کا نام یاسر ہے اور وہ پاکستان سے آیا ہے، تو گارڈ نے ایک فہرست دیکھ کر بتایا کہ اس کا نام ملاقاتیوں میں شامل ہے تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

شام ڈھلنے میں چند گھنٹے رہ گئے تھے۔ اسے واپس بھی جانا تھا، ساتھ آنے والا لڑکا بار بار واپس چلنے پر اصرار کر رہا تھا۔ ادھر ابا بھی فون پہ فون کیے جا رہے تھے، مگر شاہ رخ صاحب کا ابھی تک دیدار نہیں ہو سکا تھا۔ اداکار کے معاون کو متعدد بار یاددہانی کے بعد

بالآخر ہجوم میں اس کا نام پکار کر اسے ایک بڑے ہال میں لے جایا گیا۔ وہ تصور میں خود کو شاہ رخ سے ہاتھ ملاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

وہ اس وقت ٹھٹکا جب اس نے سجا سجایا ہال انسان سے خالی پایا۔ معاونِ خاص نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے کہا، صاحب اندر کسی اہم شخصیت کے ساتھ ڈنر کر رہے ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد معلوم ہوا کہ ڈنر ختم ہو چکا ہے، مہمان چلے گئے ہیں، ابھی وہ آرام کر رہے ہیں اور یاسر کو جلد ہی بلایا جائے گا مگر صرف پانچ منٹ کے لیے۔

''صرف پانچ منٹ کے لیے۔'' یاسر کو غصہ آنے لگا۔ بہرحال اس نے خود کو سنبھالا، اپنی جگہ سے اُٹھ کر وہ کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھا اور پردہ ہٹا کر دوسری جانب جھانکا۔ اس کمرے میں کوئی شخص جائے نماز پر نیت باندھے کھڑا تھا جس کی پیٹھ یاسر کی جانب تھی۔ آخری رکعت کے بعد اس نے سلام پھیرا اور دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیئے۔ الفاظ اس تک واضح انداز سے نہیں پہنچ رہے تھے، پھر بھی آواز آ رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''اے زیرو کو ہیرو بنانے والے اللہ! اپنی رحمت کی برسات مجھ گنہگار پر ہمیشہ رکھنا...... عظمت و عزت فقط تیرے لیے ہے...... میں ایک گنہگار ہوں۔'' اس سے آگے وہ گڑگڑانے لگا۔ اس ٹھنڈے کمرے میں بھی اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس کا ہیرو عاجزی کے ساتھ رو رہا تھا۔ دفعتاً اسے خیال آیا کہ جس سے ملنے وہ اتنا فاصلہ طے کر کے آیا ہے، وہ جس کے سامنے بیٹھا رو رہا ہے، کیوں نہ میں بھی اسی سے تعلق جوڑ لوں۔ جو لوگوں کو زیرو سے ہیرو بناتا ہے، وہ مجھے بہت اچھی طرح جانتا ہے۔'' اس کے ہیرو کی دعا کا دورانیہ بڑھ گیا۔ وہ مزید نہیں رُک سکا اور الٹے قدموں لوٹ آیا۔ باہر نکلتے وقت سیکرٹری نے کہا کہ آپ کو تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا، صاحب کی ایک کال آ گئی ہے۔ یاسر بولا، میری بھی ایک کال آ گئی ہے۔ پھر وہ واپس پلٹ آیا۔ کچھ دیر سڑک پہ بے مقصد گھومنے کے بعد اسے ایک مسجد دکھائی دی۔ لکھا تھا، مسجدِ اکبر۔ وہ اندر گھس گیا، پانی پیا، وضو کے بعد دو رکعت نماز پڑھی۔ واپسی کا سفر شروع کیا، اس کے ساتھ والا لڑکا بار بار اسے دیکھ رہا تھا۔

گھر پہنچتے ہی ابا نے پوچھا۔ ''ہو گئی میاں تمہاری ملاقات اپنے ہیرو سے؟''

''جی ہاں......'' وہ بولا۔

''کہاں ہوئی؟'' ابا نے پوچھا۔

''مسجد اکبر میں......'' وہ آہستہ سے بولا۔

''ہیں...... مسجد میں......'' ابا کا منہ کھلا رہ گیا، مگر انہوں نے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ ☆☆☆

کھوج لگانے میں حصہ لینے والے بچوں کے نام

نامعہ تحریم، کراچی۔ مطیع الرحمٰن، صفی الرحمٰن، لاہور۔ نجم السباح ازل، میانوالی۔ ارحم فرید، کسووال۔ ثمن رؤف، لاہور۔ عذرا سعید، چکی شیخ جی۔ عبدالباسط، محمد ریاض، محمد ابرار، نیاز محمد، مزمل آصف، کراچی۔ محمد اسید خان، جہلم۔ سباء شوکت، گوجرانوالہ۔ سیدہ تحریم مختار، لاہور۔ محمد شاہ زیب علی، بھلوال۔ عائشہ حریم، کوہاٹ۔ محمد حمزہ مقصود، فاطمہ اعظم، لاہور۔ طلحہ خباب علی، محمد سعد علی، گوجرانوالہ۔ محمد ریان احمد خان، اسلام آباد۔ نمرہ افضل، سعد افضل، جھنگ صدر۔ افشاں فاطمہ، فیصل آباد۔ نجم السحر، ملک وال۔ علینا اختر، کراچی۔ مومنہ قاضی، راول پنڈی۔ نادیہ منیر، لاہور۔ طارق جمیل، کراچی۔ فضا خان، مہک علی، ٹمیاری۔ عبدالرزاق، سکھر۔ حیات خان، کوئٹہ۔ حسیب بلوچ، میاں والی۔ منیبہ طیب، کراچی۔ مہر اکرم، خوشاب۔ ملائکہ نور، خان پور۔ نوشابہ امین، ٹنڈو آدم۔ کاشف علی، لاہور۔ عمران احسن، عکاشہ فیصل، کوئٹہ۔ ماہ نور پروین، خوشاب۔ سالک محبوب، گجرات۔ عفان طور، سدرہ اسلم، جھنگ۔ نوید احمد، نور پور۔ فراز علی، ملتان۔ وہاج کبیر، راول پنڈی۔ سعدیہ بشیر، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ منصور، مسعود، لاہور۔ سحرش امین، حیدر آباد۔ محمد اذان، گوجرانوالہ۔ عنایہ فاطمہ، لاہور۔ فصیل نذیر، سکھر۔ حافظ محمد علی، جہلم۔ حذیفہ علی، کمالیہ۔ حاجرہ بی بی، سرگودھا۔ یوسف ثانی، بدین۔ طلحہ ترین، کوئٹہ۔ احتشام، راول پنڈی۔ امجد علی، ملتان۔ رابعہ نسرین، شگفتہ پروین، کراچی۔ صولت مرزا، جھنگ۔ ظہیر الٰہی، پنڈ دادن خان۔ حمید خان، کوئٹہ۔ فاطمہ عمران، خدیجہ، عمران، پشاور۔ صبا قمر، لاہور۔ نورین رفیق، اسلام آباد۔ شگفتہ نسرین، راول پنڈی۔ ربیعہ نسرین، اوکاڑہ۔ ثمینہ علی، گجرات۔ ثمن رضا، ساہی وال۔ جاوید اقبال، قصور۔ نادیہ حسین، ملتان۔ کنیز فاطمہ، لاہور۔ صولت رضا، گوجرانوالہ۔ پلوشہ رحمان، کوئٹہ۔ نور فاطمہ، پشاور۔ فرناز امین، لاہور۔ توقیر احمد، گجرات۔ تنویر احمد، جاکے چٹھہ۔ تحریم فاطمہ، لاہور۔ حسیب علی، راول پنڈی۔ ناجیہ رحمان، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ پروین خان، لاہور۔ ساجدہ اصغر، گوجرانوالہ۔ شمع رانا، اسلام آباد۔ غزالہ رفیق، لاہور۔ روحی ناز، راول پنڈی۔ صاحبہ انجم، فیصل آباد۔ صاعقہ نعمان، بھلوال۔ سکینہ عائشہ، بھکر۔ اسلم وقار، کراچی۔ جنید خان، کوہاٹ۔ منجا نذیر، لاہور۔ عبدالباسط، اوکاڑہ۔ جمیل حمید، گوجرہ۔ طارق نذیر، فیصل آباد۔ ارشد ارحم، کوہاٹ۔ اویس نسیم، گوجرانوالہ۔

سادگی و قناعت، تواضع و انکساری، حلم، رزق حلال اور صدق مقال علامہ اقبالؒ کے نمایاں اوصاف ہیں۔ جب آپ کے والد شیخ نور محمد نے ڈپٹی وزیر علی بلگرامی کے ہاں ملازمت اختیار کی تو امام بی بی نے شیر خوار 'بالے' کو اپنا دودھ پلانا بند کر دیا کہ اس معصوم کی رگوں میں حرام اور ناجائز کمائی سرایت نہ کر جائے۔ انہوں نے اپنے زیورات فروخت کیے اور ایک بکری خرید لی۔ یوں 'بالے' کی پرورش ماں کے دودھ کی بجائے بکری کے دودھ پر ہونے لگی۔ یہ سلسلہ شیخ نور محمد کی جانب سے ملازمت اور اس کے ذرائع آمدن کے حوالے سے اطمینان بخش دلائل کی فراہمی تک جاری رہا۔ یہی وجہ تھی کہ والدہ نے حلال رزق میں احتیاط برتی اور جس کی وجہ سے 'بالے' کا اقبال بلند ہوا۔ وہ شاعرِ مشرق پکارا گیا، حکیم الامت بنا اور 'سر' کے خطاب سے سرفراز ہو کر ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کہلایا۔ آپ کا اقبال بلند ہوتا گیا، فقر بڑھ گیا، بے نفسی اور بے خوفی آپ کی ذات کا حصہ بن گئے۔

یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق
ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق

1922ء میں جب علامہ اقبالؒ کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں 'سر' کا خطاب دیا گیا تو ایک مؤثر حلقے نے اس پر ردعمل کا اظہار کیا۔ (حالاں کہ اس سے پہلے انگریزی حکومت کی جانب سے ادبی خدمات کے اعتراف میں لسان العصر اکبر الٰہ آبادی کو 'خان بہادر' اور مولانا شبلی نعمانی کو 'شمس العلماء' کا خطاب مل چکا تھا۔) علامہ اقبالؒ کے خیر خواہوں کو خدشہ لاحق ہوا کہ شاید شاہین زیرِ دام آ گیا ہے۔ آپ کے ایک ہمدرد اور دورِ طالب علمی کے ساتھی غلام بھیک نیرنگ نے بہ ذریعہ خط اپنے فکر کا اظہار کیا۔ جواباً علامہ نے فرمایا: ''جس دُنیا کے آپ اور میں رہنے والے ہیں اس دُنیا میں اس قسم کے واقعات و احساسات سے فروتر ہیں۔ سینکڑوں خطوط اور تار آ رہے ہیں اور مجھے تعجب ہے کہ لوگ ان چیزوں کو کیوں گراں قدر جانتے ہیں۔ باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا ہے، سو قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کی وجہ سے مجھے ایمان نصیب ہوا ہے اور میں مسلمان کہلاتا ہوں، دُنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی، ان شاء اللہ! اقبالؒ کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن ہے۔''

یہ مال و دولتِ دُنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں، لا الٰہ الا اللہ

1922ء کے بعد سے تادمِ آخر علامہ اقبال کا ہر عمل اس بات کا گواہ ہے کہ اقبالؒ اپنے قول میں صادق تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سرکارِ برطانیہ نے انہیں نائٹ ہڈ دینے کے بعد ان کی جانب سے آنکھیں نہیں موند لیں، بلکہ ان کے شب و روز کی مسلسل نگرانی ہونے لگی۔

علامہ اقبال کی دیانت داری اور قابلیت و لیاقت مسلمہ تھی۔ پٹنہ (بہار) کی ''ریاست آرہ'' کی جائیداد سے متعلق ایک مقدمہ آیا۔ عدالت کو اس سلسلے میں ایک قدیم مخطوطے کی وضاحت درکار تھی، مخطوطے کی تحریر پیچیدہ اور قدیم فارسی پر مشتمل تھی اور ناقابلِ فہم تھی۔ عدالت کی نگاہ انتخاب علامہ اقبال پر پڑی اور آپ سے درخواست کی گئی کہ اس مخطوطے سے متعلق عدالت کی راہ نمائی فرمائیں۔

اس کام کے لیے عدالت نے یومیہ ایک ہزار کا مشاہرہ طے کیا اور ساتھ ہی پیش کش کی گئی کہ اگر آپ کو متعلقہ کام کے لیے کلکتہ جانا پڑے تو وہ اخراجات بھی برداشت کیے جائیں گے۔ علامہ اقبال جس روز پٹنہ پہنچے اسی رات کاغذات کا معمہ حل کر کے اگلے دن کاغذات متعلقہ افراد کے حوالے کر دیئے۔ بیرسٹر آرداس جو یہ مقدمہ دیکھ رہے تھے، نے حیران ہو کر علامہ سے فرمایا: آپ نے یہ کیا کیا!! یہ کام تو آپ کو کئی دن میں کرنا تھا، آپ کا مشاہرہ ہزار روپے یومیہ مقرر ہوا ہے۔ کم از کم دو چار ہزار تو بنتے۔'' یہ سن کر علامہ اقبال نے جواب دیا۔ ''میرے رسولؐ نے مجھ پر ایسی کمائی حرام کر دی ہے جو کسی مختصر کام کو طول دے کر حاصل کی جائے۔''

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہیے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گل زار ہوتا ہے

یورپ کے تعلیمی اداروں میں قانون و فلسفے کی اعلیٰ تعلیم، دنیاوی اعزازات اور شہرت کی بلندیاں بھی اقبال کی فطری سادگی اور بے نفسی کو متاثر نہ کر سکیں، بلکہ وہ غرور اور نخوت سے بچنے کی کوشش کرتے رہے۔ اسی کمال احتیاط کا مظاہرہ راجا نریندر ناتھ کے گھر اس وقت دیکھنے میں آیا جب علامہ راجا کے گھر بچھی ہرن کی کھالوں سے بچ بچ کر گزر رہے تھے۔ راجا نریندر نے حیرت کے ساتھ ہرن کی کھال پر قدم رکھنے سے اجتناب کا سبب جاننا چاہا تو اقبالؒ گویا ہوئے: ''میرے اُستادِ محترم مولوی میر حسن نے ایک مرتبہ ہرن کی کھال کے جائے نماز استعمال نہ کرنے کا سبب بتاتے ہوئے انکشاف کیا تھا کہ ہرن کی کھال پر بیٹھنے سے انسان کے دل میں لاشعوری طور پر غرور کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم

9 جنوری 1937ء میں علامہ اقبال کو ملی خدمات کے اعتراف میں ہندوستان سمیت دُنیا کے مختلف خطوں میں ''یومِ اقبال'' منایا گیا۔ (یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ بدستور بیماری اور معاشی تنگ دستی کا شکار تھے۔) اس پس منظر میں 10 جنوری 1937ء کو سر اکبر حیدری نے شاہی توشہ خانے کی طرف سے علامہ کی خدمت میں 1000 روپے کا چیک بھیجا۔ غیرتِ اقبال کے لیے یہ چیک کسی تازیانے سے کم نہ تھا لہٰذا آپ نے نہ صرف چیک واپس کر دیا بلکہ اپنے مجروح جذبات کا اظہار جن الفاظ اور اشعار میں کیا وہ آج بھی ''ارمغانِ حجاز'' کا حصہ ہیں:

صدر اعظم حیدر آباد دکن کے نام

'یومِ اقبال' کے موقع پر توشہ خانہ حضور نظام کی طرف سے جو صاحب صدر اعظم کے ماتحت ہے، ایک ہزار کا چیک بطور 'تواضع' موصول ہونے پر:

تھا یہ اللہ کا فرمان کہ شکوہِ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بارِ امانت کو اُٹھاتا سرِ دوش
کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات!

علامہ اقبالؒ ایک جگہ فرماتے ہیں:

خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

پیارے بچو! یہ تھیں اقبالؒ کی اعلیٰ صفات جن کی بناء پر وہ مردِ درویش کہلائے۔ اقبالؒ کا عمل قابلِ تقلید ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اقبال کی فکر کا ترجمان بنا دے۔ آمین!

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ علامہ اقبالؒ کی اس فارسی کتاب کا نام بتایئے جس کا دیباچہ اُردو میں لکھا گیا۔

i۔ رموزِ بے خودی ii۔ پیام مشرق iii۔ بالِ جبریل

2۔ پاکستان کی کس مِل کے 20 ایکڑ رقبے میں 10 میٹر بلند اور 2 میٹر چوڑا سنگِ مرمر کا ہتھوڑا بنا ہوا ہے جس پر آیاتِ قرآنی کندہ ہیں؟

i۔ اسپارکو ii۔ آرڈیننس فیکٹری iii۔ پاکستان اسٹیل مِل

3۔ حضورِ اکرم ﷺ کے نبی ہونے کی تصدیق سب سے پہلے کس نے کی؟

i۔ ورقہ بن نوفل ii۔ حضرت خدیجہؓ iii۔ حضرت حمزہؓ

4۔ "کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے ....

یہ شعر بانگِ درا سے لیا گیا ہے۔ شعر مکمل کیجیے۔

5۔ عراق کے پرچم کے وسط میں تین ستارے کس رنگ میں دکھائے گئے ہیں؟

i۔ سبز رنگ میں ii۔ سرخ رنگ میں iii۔ پیلے رنگ میں

6۔ قیامِ پاکستان کے بعد کس شہر کو سندھ کا دارالحکومت بنایا گیا تھا؟

i۔ سکھر ii۔ نواب شاہ iii۔ حیدر آباد

7۔ انگلینڈ کی کرکٹ ٹیم کی ٹیسٹ کیپ کا رنگ کون سا ہے؟

i۔ سرخ ii۔ نیلا iii۔ پیلا

8۔ واٹر گیس کسے کہتے ہیں؟

i۔ کاربن مونو آکسائیڈ ii۔ آکسیجن iii۔ ہائیڈروجن

9۔ مسوڑھوں کے لیے سب سے زیادہ کون سے وٹامن درکار ہوتے ہیں؟

i۔ وٹامن اے ii۔ وٹامن ڈی iii۔ وٹامن سی

10۔ شیرِ نیستاں کا کیا مطلب ہے؟

i۔ بہادر شیر ii۔ جنگل کا شیر iii۔ شیرِ خاموشاں

جواباتِ علمی آزمائش اکتوبر 2015ء

1- رفیق الغار 2- مسجد ذوقبلتین 3- موہنجوداڑو 4- ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں 5- فاطمہ صغریٰ 6-بوبی 7- حضرت عباسؓ 8- ابوالکلام آزاد 9- گولڈن ڈک 10- سفید

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ مرزا حمزہ بیگ، حیدر آباد (150 روپے کی کتب)

☆ عائشہ ذوالفقار، لاہور (100 روپے کی کتب)

☆ محمد ریحان المصطفیٰ، فیصل آباد (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:

شاہ زیب علی بھلوال، جواد احمد، کراچی۔ حلیمہ اسحاق، جہلم۔ حیدر رحمٰن، اکوڑہ خٹک۔ مومنہ قاضی، راول پنڈی۔ عدن سجاد، جھنگ۔ طٰہٰ محمود، لاہور۔ سمعیہ توقیر، کراچی۔ حفصہ اعجاز، باڑہ ہملٹ۔ شمائلہ ناز، محمد ضیاء اللہ، میانوالی۔ شجاع الحسن خان، لاہور۔ عائشہ سید، پشاور۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ محمد اکرم صدیقی، برنولی۔ نمرہ افضل، محمد افضل، جھنگ صدر۔ محمد سمیع، کراچی۔ محمد حمزہ، راول پنڈی۔ ماموں شفقت، اکوڑہ خٹک۔ ملک محمد احسن، راول پنڈی۔ نجم السحر، بھلوال۔ آمنہ عبدالستار، چتوکی۔ محمد حمزہ مقصود، لاہور۔ مریم رضوان، راول پنڈی۔ محمد احمد، کظیمہ زہرہ، احور کامران، زل کامران، لاہور۔ صفیہ ناز، ساہی وال۔ رقیہ بتول، کراچی۔ ام حبیبہ، سیال کوٹ۔ دُرِ نجف، کوئٹہ۔ صالحہ کاروار، صائمہ کاروار، ملتان۔ نادرہ بتول، ربیعہ اقبال، پشاور۔ فخر النساء، شکیلہ ناز، کشور ملک، لاہور۔ ثانیہ سعید، جھنگ۔ عمران توفیق، ساہی وال۔ ثمین ناز، ضحویٰ بتول، کوئٹہ۔ ظل ہما، کراچی۔ جمیلہ نورین، علینہ جواد، صوفیہ بٹ، بہاول پور۔ تحریم احمد، حیدر آباد۔ ایمن فاطمہ، راول پنڈی۔ صائم قریشی، سعادیہ کریم، سکھر۔ جواد نذیر، نواب شاہ۔ توفیق احمد، اسلم کمال، واہ کینٹ۔ جاوید اقبال، محمد قاسم، ثمینہ رفعت، بھکر۔ تنویر کمال، ذاکر حسین، میاں والی۔ جمیل اقبال، اسلام آباد۔ عظیم النساء، لاہور۔ زبیدہ ارسلان، فیصل آباد۔ آصفہ اسلم، کراچی۔ زعیمہ فیصل، اسلام آباد۔ عاتکہ اکبر، ایبٹ آباد۔ زہرہ جبیں، فیصل آباد۔ نجمہ اسحاق، اسلام آباد۔ شکیلہ رانا، فیصل رانا، جھنگ۔ اجالا ادریس، مصباح عتیق، کوہاٹ۔ زریاب خان، پشاور۔ کوثر اشفاق، ملتان۔ شازیہ اکبر، نازیہ اکبر، راول پنڈی۔ سحر اعجاز، لاہور۔ معظمہ شفیق، لاہور۔ آمنہ رفیق، واہ کینٹ۔ شاہینہ آسیہ، چتوکی۔ روحی اعجاز، پشاور۔ عالیہ خان، کوہاٹ

شیخ عبدالحمید عابد

اِنسان دوستی......سب سے بالاتر

شہر آنے سے پہلے ہم لوگ گاؤں چاند پور میں رہتے تھے۔ گاؤں میں سارے لوگ پیار و محبت سے رہتے تھے۔ گاؤں میں ایک بابا جی بھی تھے جن کی عمر اسی پچاسی سال کے درمیان ہوگی جھکی ہوئی کمر، ہاتھ میں لاٹھی، آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک مگر ان کی ہمت جوانوں جیسی تھی۔ نام تو ان کا بشیر تھا لیکن گاؤں میں بابا بیرو کے نام سے مشہور تھے۔

کہتے ہیں بابا بیرو کے باپ نے پیدائش سے پہلے یہ منت مانی تھی کہ اگر ان کے ہاں لڑکا ہوا تو وہ سائیں سدورے کے نام کا ایک درخت لگائیں۔ چناں چہ بابا بیرو کی پیدائش کے بعد انہوں نے اپنی منت پوری کرنے کے لیے گاؤں کے بڑے ٹیلے کے پاس ایک برگد کا درخت لگایا تاکہ وہاں سے گزرنے والے مسافروں کو آرام مل سکے۔ بابا بیرو اور برگد کا درخت ہم عمر تھے۔

ٹیلے کے اوپر اس کا گھر تھا اور گھر کے اطراف میں ایک باغیچہ تھا۔ بابا بیرو کو پھولوں، پودوں، درختوں اور چڑیوں سے عشق تھا۔ پھول اس کی کمزوری تھے۔ میں جب بھی اس کے باغیچے میں جاتا، مجھے لگتا جیسے میں کسی اور ہی دُنیا میں آ گیا ہوں، جہاں ہر طرف پھولوں کی بہار ہوتی۔ بابا بیرو مجھے ہمیشہ اپنے باغیچے میں کام کرتے ہوئے ملتا۔ کبھی تو وہ نئے پودے لگانے کے لیے زمین کھود رہا ہوتا اور کبھی درختوں کے سوکھے پتے توڑتا ہوا دکھائی دیتا۔ وہ جب بھی مجھے ملتا، بڑی محبت سے ملتا۔ مجھے بھی اس سے بہت اُنس تھا۔ وہاں آنے کے بعد میرا گھر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں اکثر ٹیلے کے پاس سے گزرتے ہوئے برگد کے درخت کو دیکھتا تو مجھے بابا بیرو یاد آ جاتا۔ میں سوچتا اس درخت اور بابا بیرو میں کتنی مشابہت ہے۔ برگد کے درخت کی تڑختی کھال دیکھ کر مجھے بابا بیرو کا جھریوں والا چہرہ یاد آ جاتا اور برگد کی داڑھی مجھے بابا بیرو کی داڑھی لگتی، مگر میں اکثر سوچتا کہ بابا بیرو کا قد برگد کے درخت جتنا کیوں نہیں ہے؟ اس خیال پر مجھے خود بھی ہنسی آتی مگر اس خیال نے میرے ذہن کو مکڑی کی طرح ہر طرف سے جکڑ لیا۔ آخر ایک دن میں نے بابا بیرو سے یہ سوال کر ڈالا۔ بابا بیرو کام کرتے رُک گیا۔ میری طرف غور سے دیکھا اور پھر ہنس کر بولا۔

”دیکھو بیٹے! کوئی چیز ہمیشہ باقی نہیں رہتی ہر چیز فنا ہو جائے گی مگر عمل اور خیال کی بلندی انسانوں کو پہاڑوں سے بھی اونچا کر دیتی ہے۔ نیکی اور عمدہ کردار کا اثر پتھر کی لکیر کی طرح ہمیشہ دلوں پر نقش رہتا ہے۔“ بابا بیرو ہمیشہ ایسی باتیں کرتا اور ایسی باتیں ہمیشہ میرے سر سے گزر جاتیں۔

بابا بیرو کو پھولوں سے بڑی محبت تھی۔ ان پھولوں اور پودوں

کو وہ اپنے بچوں کی طرح چاہتا تھا اور ان کا بیچنا اسے گوارا نہ تھا۔
ایک دن میں معمول کے مطابق بابا بیرو سے ملنے آیا تو خلافِ توقع بابا بیرو کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آئیں۔ بابا بیرو کسی سے جھگڑ رہا تھا۔

یہ میرے لیے حیرانی کی بات تھی۔ میں نے سنا وہ آدمی کہہ رہا تھا۔ ''جناب میں ان دو پودوں کے پچاس روپے دینے کو تیار ہوں۔ اب تو مان جائیے۔'' پھر مجھے بابا کی غصیلی آواز سنائی دی۔ ''میں نے کہہ دیا یہ پھول اور پودے بیچنے کے لیے نہیں ہیں۔ روپے پیسے سے آپ ان پھولوں کو خرید تو سکتے ہیں مگر ان کے حقیقی رنگ و بو سے آپ لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ یہ حقیقی مسرت تو صرف ان پھولوں کی کاشت سے ہوتی ہے۔'' وہ آدمی اس کے بعد خاموشی سے چلا گیا۔

دن گزرتے گئے۔ بابا بیرو کی کمر جھکتی گئی مگر اس کے باغ کی دلکشی بڑھتی گئی۔ برگد کا درخت اسی ٹیلے پر کھڑا رہا اور وہ سوال میرے ذہن میں گونجتا رہا۔ ایک دن گاؤں کے قریب بہنے والے دریا کو غصہ آ گیا۔ کھیت و مکان انسان سب ہی سیلاب سے متاثر ہو گئے مگر بابا بیرو کا مکان ٹیلے پر ہونے کی وجہ سے محفوظ رہا اور وہ برگد کا درخت سینہ تانے اسی طرح کھڑا رہا۔ انہی دنوں گاؤں میں ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی۔ گاؤں والوں کے لیے پہلے ہی مصیبتیں کم نہ تھیں کہ اب رہی سہی کسر اس ہیضے نے پوری کر دی۔ ان دنوں بابا بیرو بہت مضطرب اور پریشان لگتا تھا۔ لگتا تھا اسے کوئی خیال اندر ہی اندر سے ستائے جا رہا ہے۔ اس دن میں بابا کے پاس گیا تو بابا حسرت سے ایک ایک پھول کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو کچھ دیر چپ رہا، پھر بولا۔ ''پتر میں نے باغ بیچ دیا ہے۔'' میں نے دیکھا وہ آدمی جس کو اس دن بابا نے بہت زور سے ڈانٹا تھا، بابا کے پاس سے خوش خوش نکلا تھا۔ بابا کے ہاتھ میں اس وقت چند روپے تھے۔ بابا کے اس فیصلے پر مجھے بہت حیرت ہوئی۔

میں نے کہا۔ ''بابا یہ تم نے کیا کیا؟ اپنی سب سے قیمتی چیز کو یوں کوڑیوں کے مول ناقدروں کے حوالے کر دیا۔''

بابا کچھ دیر چپ کھڑا رہا۔ عینک کے موٹے شیشوں کے پاس اس کی آنکھوں سے آنسو چھلکتے صاف نظر آ رہے تھے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''پتر! انسان دوستی سب سے بالاتر ہے۔ پھولوں سے محبت نے مجھے انسان سے محبت کرنا سکھا دی ہے۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ گاؤں کے اوپر دکھ کے بادل منڈلاتے پھریں اور میں اپنے پھولوں پودوں میں مگن رہوں۔ میرے فیصلے سے اگر گاؤں والوں کے آنگن میں خوشی کے پھول کھل سکیں تو بیٹے یہ بہت بڑا کام ہوگا۔''

بابا نے اسی دن میرے ساتھ جا کر وہ ساری رقم امدادی کیمپ میں جمع کرا دی جو گاؤں والوں کے لیے کھولا گیا تھا۔ اس دن مجھے ایسا لگا جیسے بابا کا قد ہم سب سے اُونچا ہے۔ اُونچا، اُونچا...... اور بہت اونچا، برگد کے درخت سے بھی اُونچا۔

گاؤں کی خوشیاں پھر سے لوٹ آئیں۔ برگد کا درخت آج بھی اسی ٹیلے پر قدم جمائے کھڑا ہے۔ گاؤں کے لوگ اور مسافر اس کے سائے میں آرام کرتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے بچے، بوڑھے برگد کی لمبی داڑھی پکڑ کر جھولتے ہیں، مگر اس دن کے بعد بابا بیرو گاؤں کے کسی شخص کو نظر نہیں آیا۔ ☆☆☆

جمرات

حج کے دوران کنکریاں مارنے کے عمل کو جمرہ کہا جاتا ہے۔ شیطان کو کنکریاں مارنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ انہوں نے جمرہ کو اس وقت کنکریاں ماریں جب وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے منیٰ کی طرف آئے۔ اس موقع پر شیطان بھیس بدل کر انہیں اس ارادے سے باز رکھنے کے لیے آیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شیطان کو پہچان لیا اور کنکر اُٹھا کر مارے۔ شیطان نے دوبارہ بلکہ سہ بارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بہکانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے ہر بار اسے پہچان لیا۔ مزدلفہ اور منیٰ کے قریب تین مقامات آتے ہیں جہاں کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ مسجد خیف کے متصل جو نشان ہیں اسے جمرۃ الاولیٰ یا جمرۃ الدنیا، دوسرے کو بجانب مکہ مکرمہ جمرۃ الوسطیٰ اور تیسرے کو جمرۃ العقبہ یا جمرۃ الکبریٰ کہتے ہیں۔ عام لوگوں میں یہ نشان چھوٹا شیطان، منجھلا شیطان اور بڑا شیطان کے نام سے مشہور ہیں۔ ان مقامات میں سات سات کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ پہلے رمی کا وقت 10 ذی الحجہ صبح صادق سے 11 ذی الحجہ صبح صادق تک ہے۔ رمی کا وقت طلوع آفتاب سے زوال آفتاب تک مسنون ہے۔ 10 ذی الحجہ کو ہدف جمرۃ العقبہ پر رمی کی جائے اور اس رمی کی سات کنکریاں مزدلفہ سے اُٹھانا مستحب ہے۔ کنکریاں جمروں سے کسی حالت میں نہ اُٹھائی جائیں۔ عورتیں رات کو رمی کریں تو اچھا ہے۔ کنکریاں مارتے وقت کنکر انگوٹھے اور انگشت شہادت میں پکڑ کر ایک ایک کر کے مارنی چاہیے۔ اگر ساری اکٹھی پھینکی جائیں تو ایک شمار ہوگی۔

یہ برسوں پرانی بات ہے جب جاپان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک غریب کسان اور اس کی بیوی رہا کرتے تھے۔ یہ دونوں بڑے نیک تھے۔ ان کے کئی بچے تھے، اس لیے ان سب کو پالنا پوسنا اور کھلانا پلانا مشکل ہو رہا تھا۔

بڑا بچہ تیرہ برس کی عمر میں اس قابل ہو گیا تھا کہ اپنے باپ کی مدد کر سکے اور اس کی بیٹیاں گھر کے کام کاج میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ اس کے برعکس سب سے چھوٹا بچہ اپنے باقی بہن بھائیوں سے زیادہ ہوشیار تھا لیکن وہ اس قدر کمزور اور چھوٹا تھا کہ محنت کا اہل نظر نہیں آتا تھا۔ جو کوئی اسے دیکھتا، یہ کہتا کہ یہ لڑکا تن درست و توانا نہیں ہو گا۔ اس کے ماں باپ نے ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سوچا کہ بہتر یہی ہو گا کہ یہ لڑکا کسان کے بجائے مذہبی آدمی بن جائے۔

ایک روز وہ اسے گاؤں کی عبادت گاہ لے گئے اور وہاں بوڑھے نیک دل راہب سے درخواست کی کہ اس لڑکے کو اپنا شاگرد بنا لے اور اسے ساری مذہبی باتیں سکھا دے۔

بوڑھے راہب نے بہت شفقت کے ساتھ اس لڑکے سے بات کی اور دو چار مشکل سوال پوچھے۔ لڑکے نے اس ذہانت سے جواب دیے کہ راہب نے اسے عبادت گاہ میں داخل کرنے اور تعلیم دینے کی ہامی بھر لی۔ بوڑھا جو بھی اسے سکھاتا، لڑکا جلدی سے سیکھ لیتا۔ وہ سارے کاموں میں بوڑھے راہب کا بڑا فرماں بردار تھا مگر اس میں ایک خرابی تھی۔ وہ پڑھنے کے دوران بلی کی تصویر بناتا رہتا اور ایسی جگہوں پر بھی تصویر بناتا جہاں بلی کی تصویر نہیں بنانی چاہیے۔ راہب کی کتابوں کے حاشیے پر، عبادت گاہ کے پردوں پر، دیواروں اور ستونوں پر وہ بلی کی تصویریں بنائے جاتا۔ راہب نے اسے کئی بار ٹوکا مگر وہ تصویریں بنانے سے باز نہیں آیا۔

وہ تصویریں اس لیے بناتا تھا کہ اس کا اپنے آپ پر بس نہیں چلتا تھا۔ اس میں وہ چیز تھی جسے ''مصور کا جوہر'' کہتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ راہب کا شاگرد بننے کے قابل بھی نہیں تھا۔ ایک دن جب وہ پردے پر بلی کی بڑی ماہرانہ تصویر بنا کر اُٹھا تو بوڑھے راہب نے سخت لہجے میں اس سے کہا۔

''میرے بچے! اب تمہیں اس عبادت گاہ سے چلا جانا چاہیے۔ تم کبھی اچھے عالم نہیں بن سکو گے مگر شاید تم بہت بڑے مصور بن جاؤ۔ اب میں تمہیں آخری مشورہ دے دوں، میری بات گرہ باندھ لو، اور اسے ہرگز نہ بھولنا..... رات کے وقت بڑی جگہوں سے بچنا، چھوٹی جگہوں پر رہنا۔''

لڑکے کی سمجھ میں نہیں آیا کہ راہب کا اس بات سے کیا مطلب تھا۔ وہ سوچتا رہا، اپنے کپڑوں کی گٹھڑی باندھتے ہوئے بھی سوچتا رہا مگر اس کے سمجھ میں نہیں آیا اور اب اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ راہب سے اس بات کا مطلب پوچھ لے۔ وہ بس خدا حافظ کہہ سکا۔ دکھے دل کے ساتھ وہ عبادت گاہ سے باہر نکلا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کرے؟ اگر گھر جاتا تو اس بات کا

یقین ہے کہ ابا اس بات پر سزا دیں گے کہ راہب کی نافرمانی کی۔ اس لیے وہ گھر جاتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔

اچانک اسے یاد آیا کہ اگلے گاؤں میں جو بارہ میل دور ہے، ایک بہت بڑی عبادت گاہ ہے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ وہاں بہت سے راہب ہیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس گاؤں چلا جائے گا اور ان راہبوں سے کہے گا کہ اسے اپنا شاگرد بنالیں۔

وہ عبادت گاہ کافی دن سے بند پڑی تھی، مگر اس لڑکے کو یہ بات معلوم نہ تھی۔ عبادت گاہ اس لیے بند ہوگئی تھی کہ ایک بھتنا وہاں آ گیا تھا۔ اس بھتنے نے راہبوں کو بھگا دیا اور اس جگہ پر قبضہ جما لیا تھا۔ کئی ایک بہادر عبادت گاہ میں گئے کہ بھتنے کو نکال دیں مگر وہ زندہ پلٹ کر نہ آئے۔ یہ ساری باتیں کسی نے بھی اس لڑکے کو نہیں بتائی تھیں، اس لیے وہ اطمینان کے ساتھ قدم اُٹھاتا ہوا عبادت گاہ کی طرف چل پڑا، اس اُمید پر کہ وہاں راہب اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے۔

جب وہ اس گاؤں میں پہنچا تو رات ہو چکی تھی اور گاؤں والے سو گئے تھے۔ لڑکے نے دیکھا کہ گاؤں میں تو نیند کا وقت ہو گیا مگر عبادت گاہ میں روشنی ہو رہی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بھتنا آسیب زدہ مقام پر چراغ جلا لیتا تھا تاکہ بھولے بھٹکے مسافر دھوکا کھا کر وہاں پناہ لینے اور رات گزارنے آ جائیں۔

لڑکا فوراً عبادت گاہ کی طرف چل پڑا اور وہاں پہنچ کر دروازے پر دستک دینے لگا۔ اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ اس نے پھر دستک دی۔ جواب میں کوئی آواز نہ آئی، نہ کوئی اندر سے نکلا۔ لڑکے نے دروازے کو دھکا دے کر دیکھا کہ چراغ جل رہا ہے اور کوئی نہیں ہے۔ لڑکے کو خیال ہوا کہ کوئی نہ کوئی راہب جلدی آ جائے گا اس لیے وہ وہاں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

پھر اسے احساس ہوا کہ عبادت گاہ میں ہر چیز خاک دھول سے اٹ رہی ہے اور چاروں طرف مکڑی کے جالے لٹک رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس نے سوچا، یہاں کے راہبوں کو ایک شاگرد کی واقعی ضرورت ہے جو ہر چیز کو صاف ستھرا رکھ سکے۔ اس نے سوچا کہ ان لوگوں نے بھلا اس عبادت گاہ کو اس قدر خستہ حال کیوں رکھا ہوا ہے؟ اس نے دیکھا کہ وہاں پردے اور دیواریں موجود ہیں اور وہ یہ دیکھ کر خوش ہوا کہ یہ خالی جگہیں بلیاں بنانے کے لیے خوب ہیں، حال آں کہ وہ تھکا ماندہ تھا مگر خالی جگہیں دیکھ کر اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر قلم دان نکالا اور روشنائی میں قلم ڈبو کر بلیوں کی تصویریں بنانے لگا۔ اس نے در و دیوار پر بہت سی بلیاں بنائی اور خالی جگہیں کو بلیوں کی تصویر سے بھر دیا۔

پھر اسے نیند آنے لگی، گہری نیند۔ وہ وہیں دیوار کے پاس پڑ کر سونے کو تھا کہ اچانک اسے اپنے اُستاد کے الفاظ یاد آئے۔

”رات کے وقت بڑی جگہوں سے بچ کر رہنا، چھوٹی جگہوں پر رہنا۔“

عبادت گاہ بہت بڑی تھی۔ وہ وہاں اکیلا تھا اور جب اس نے اس بات پر دھیان دیا...... حال آں کہ یہ بات ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی...... تو زندگی میں پہلی دفعہ اسے ڈر محسوس ہوا۔ اس نے ارادہ کیا کہ کوئی چھوٹی سی جگہ تلاش کر کے وہیں سو جائے۔ اس نے تلاش کیا تو ایک الماری ملی جس کے پٹ اندر سے بند ہو جاتے تھے، وہ اندر گھس گیا۔ پٹ اندر سے بند کر لیے اور سو گیا۔

رات بیت چلی تھی۔ بہت وقت ہو گیا تو ایک بھیانک شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے کوئی لڑ رہا ہو، چیخ رہا ہو۔ شور اس قدر ہول ناک تھا کہ اس کی ہمت نہ ہوئی کہ الماری کی درز میں سے جھانک کر دیکھ لے۔ وہ وہیں ساکت پڑا رہا، ڈر کے مارے سانس بھی روک لی۔ عبادت گاہ میں جو چراغ جل رہا تھا، ایک دم سے بجھ گیا۔ اندھیرے میں آوازیں اور بھی خوف ناک لگ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ رگوں میں لہو جم جائے گا۔ عبادت گاہ ان آوازوں میں سے تھرتھراتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ الماری کے اندر دبکا پڑا رہا۔

شور تھم گیا اور چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ وہ اب بھی الماری کے اندر چپ چاپ بیٹھا رہا، یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ جب الماری کی درزوں میں سورج کی روشنی چھن چھن کر آنے لگی، تب وہ اپنی پناہ گاہ سے باہر آیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ سب سے پہلی چیز جو اسے نظر آئی وہ یہ تھی کہ عبادت گاہ کہ سارے فرش پر خون ہی خون ہے۔

پھر اس نے دیکھا کہ خون میں لت پت، ایک بہت ہی بڑا، دیوقامت چوہا...... بھتنا چوہا...... وہاں پڑا ہوا ہے۔ قد میں گائے سے بھی بڑا ہے مگر اس بھتنے کو کس نے مارا؟ وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ نہ آدمی، نہ جانور۔

پھر اس کی نظر پڑی کہ رات کو اس نے جو دیوار پر بلیاں بنائیں تھیں، ان کے منہ کو خون لگا ہوا ہے۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ اس نے جو بلیاں بنائیں تھیں، انہوں نے اس بھتنے کو مارا تھا اور تبھی اسے اندازہ ہوا کہ اس کہ اُستاد نے اس سے کیوں کہا تھا۔

”رات کے وقت بڑی جگہوں سے بچ کر رہنا، چھوٹی جگہوں پر رہنا۔“

عبادت گاہ کی اس رات کے بعد وہ لڑکا بڑا ہو کر بڑا مشہور مصور بن گیا۔ اس کی بنائی ہوئی بلیاں اب بھی جاپان آنے والے سیاحوں کو دکھائی جاتی ہیں۔ (ماخوذ)

☆☆☆
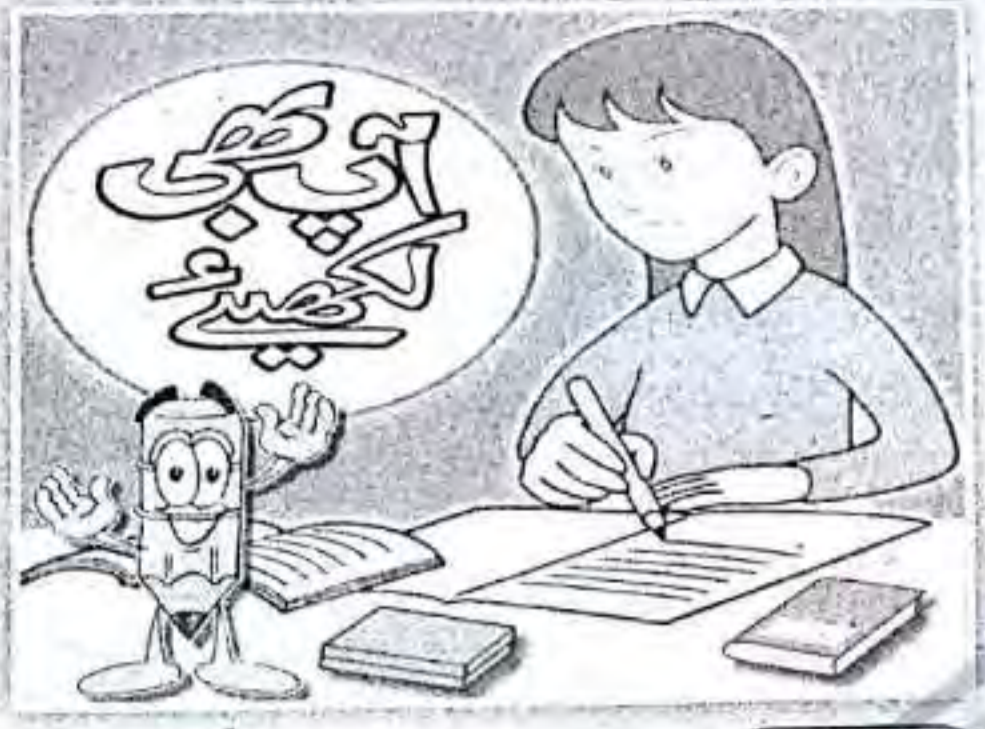
نیکی کا فرشتہ

(ظل حنا، شیخوپورہ)

گرمیوں کی چھٹیاں ہوتے ہی حسنات، جگنو اور حنا کی چھوٹی سی دُنیا میں بہار آ گئی۔ تینوں دن بھر شرارتیں کرتے۔ کوئی روکنے والا بھی نہ تھا۔ حسنات کے مزے دار لطیفے سن کر ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑ جاتے اور ہر وقت تینوں کے معصوم قہقہے فضا میں گونجتے رہتے۔ یکا یک ہمیشہ منہ پھلائے رہنے والی بدمزاج اور مغرور روحی باجی بورڈنگ چھوڑ کر گھر آ ٹپکی اور ان کی شرارتوں میں بریک لگ گئی۔ کھانے کی میز پر حسنات کوئی دل چسپ لطیفہ سناتا، حنا اور جگنو قہقہہ لگاتے۔ امی ابا کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل جاتی مگر روحی باجی بڑا سا منہ بنا کر کہتی: ''اونہہ...... بدتمیز! کیا بے وقت کی راگنی الاپ رہے ہو۔ خاموشی سے کھانا کھاؤ۔'' ''کیا گدھے کی طرح ڈھینچوں، ڈھینچوں لگا رکھی ہے؟'' امی بھی سن کر ڈانٹ پلاتیں۔ ''ہاں! ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔'' باجی معمولی معمولی باتوں پر اپنی سہیلیوں کے سامنے حنا کو موٹی بیگم اور حسنات کو سانولے پن کی وجہ سے مسٹر کول تار کہتیں اور مسکراتے تو یوں لگتا گویا رو رہے ہوں۔

تینوں کے دلوں میں باجی سے انتقام لینے کی زبردست آگ بھڑک اُٹھی اور پھر تینوں نے باغ کے کونے میں کانفرنس کی۔ طرح طرح کی ترکیبیں ننھے منے دماغوں نے سوچیں۔ حسنات کا کہنا تھا کہ روحی باجی کو پوشیدہ طریقے سے ستایا جائے مثلاً موقع پاتے ہی ان کی چیزیں اِدھر اُدھر کر دیں۔ کھانے میں دل کھول کر نمک اور مرچیں گھول دیں کیوں کہ باورچی خانہ ان کے چارج میں تھا۔

حنا اس کے خلاف تھی، اس کا کہنا تھا کہ یہ بڑے بہت چالاک ہوتے ہیں۔ کبھی پکڑ لیا تو......؟ اور اس کا جواب حسنات کو بھی نہ سوجھا۔ سر کھجا کر بولا: ''تو پھر تم ہی بتاؤ، کیا کریں؟''

''بھئی، مجھے بھی تو کچھ کہنے دو۔'' جگنو نے کہا۔ ''کہو بھائی! تم بھی کہو۔'' حسنات نے کہا۔ جگنو نے سمجھایا کہ وہ جو نانی اماں کہا کرتی ہیں نا کہ انسان کے کندھوں پر دو فرشتے ہوتے ہیں۔ ایک نیکی کا اور دوسرا بدی کا۔ حنا اور حسنات نے کہا۔ ''ہاں، ہوتے تو ہیں پھر......''

''پھر کیا...... میرے نزدیک آؤ۔'' جگنو نے نجانے دونوں کے کان میں کیا کہا کہ دونوں خوشی سے اُچھل پڑے۔

دوسرے دن روحی باجی کو ایک لفافہ ملا۔ تحریر بے ڈھنگی سی لیکن پھر بھی جانی پہچانی۔ انہوں نے لفافہ کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

اے بدمزاج اور مغرور لڑکی!

تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ تیرے غرور اور بچوں سے نفرت کرنے کی وجہ سے اللہ پاک تجھ سے سخت ناراض ہیں۔ تیری بھولی بھالی صورت دیکھ کر مجھے رحم آتا ہے، اس لیے میں تجھے خبردار کرتا ہوں کہ غرور اور بچوں سے نفرت کرنا چھوڑ دے۔ بچے پھول ہوتے ہیں۔ سختی سے کملا جاتے ہیں۔ فقط تیرے کندھے پر رہنے والا فرشتہ نیکی۔

باجی کی بھنویں تن گئیں۔ دوسرے ہی لمحے ان کے ہونٹوں پر تبسم دوڑ گیا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے جگنو کے کمرے کی طرف بڑھی۔ میز پر سے اس کی اُردو کی کاپی اُٹھا کر دیکھی۔ مسکراتی ہوئی، ہولے ہولے قدم اُٹھاتی اپنے کمرے کی طرف بڑھی اور زور سے پکاریں۔ ''حسنات، جگنو، حنا ادھر آؤ تینوں۔'' تینوں ڈرتے ڈرتے آہستہ آہستہ باجی کے کمرے کی طرف بڑھے اور دروازے پر رُک گئے۔

''وہاں کیوں کھڑے ہو، اندر آ جاؤ۔'' جب تینوں اندر پہنچے تو باجی مسکرائیں اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ''ننھے فرشتو! ادھر آؤ۔'' اشارہ جگنو کی طرف تھا۔ سہا ہوا جگنو باجی کی طرف گیا۔ ''یہ تم نے لکھا ہے نا۔'' انہوں نے کہا تو جگنو کا منہ سفید پڑ گیا۔ اس نے باجی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں شبنم جیسے آنسو تیر رہے تھے۔

وہ جگنو کو پیار کرتے ہوئے بولیں۔ ''جگنو! تم واقعی نیکی کے فرشتے ہو۔ تم نے میرے ساتھ نیکی کی جس کی روشنی مجھے اندھیرے سے نکال کر اُجالے میں لے آئی۔'' جگنو، حسنات اور حنا پکڑے جانے کے بعد بھی باجی میں یہ تبدیلی دیکھ کر حیران رہ گئے، مگر

دوسرے ہی لمحے تینوں باجی سے لپٹ گئے۔ "ہماری پیاری باجی۔"

(پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

اُمیدِ صبح جمال

(یمنہ متانت، لاہور)

اسکول میں ہمارے ماہانہ ٹیسٹ ہو رہے تھے۔ میں جماعت میں وقتِ مقررہ کے پانچ دس منٹ بعد داخل ہوئی تھی۔ میں مس سے پرچہ لے کر اپنی نشست پر بیٹھ گئی اور جلدی جلدی سوال کرنے لگی۔ پرچہ بہت آسان تھا۔

آٹھ بجے گھنٹی بجی۔ مس صاحبہ نے لڑکیوں سے پرچے جمع کرنے شروع کیے۔ جب سب لڑکیوں نے پرچے دے دیئے تو مس نیچے آفس میں پرچے دینے چلی گئیں۔ اس دوران لڑکیوں نے ایک دوسرے سے اپنے جوابات کی تصدیق کرنے لگیں۔

اسی دوران تیسری صف کی پہلی سیٹ پر بیٹھی اینہ ہماری توجہ کا مرکز بن گئی۔ اس نے سب سے پہلے سر درد کی شکایت کی تھی۔ مس اس کے قریب ہی کھڑی تھیں۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا اس نے صبح کو ناشتا کیا تھا؟ اس نے نفی میں سر ہلایا تو مس فہمیدہ نے لڑکیوں سے کہا کہ اسے کھانے پینے کو کچھ دیں۔ ایک لڑکی نے اسے جوس دیا اور ایک لڑکی نے بسکٹ دیئے۔ اس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ اس کی حالت کتنی سنجیدہ ہو چکی ہے۔

اینہ کی نظر کمزور ہے۔ وہ نائٹ بلائنڈ بھی ہے یعنی اسے اندھیرے میں دیکھنے میں دقت ہوتی ہے۔ اکثر جب ہم اسکول کی لائبریری یا میدان میں آ جا رہے ہوتے تو وہ میرا ہاتھ تھام لیتی تھی۔ لائبہ نے ڈبے میں اسٹرا ڈال کر اس کے منہ سے لگایا، تب کہیں اس نے آدھا ڈبا جوس کا پیا اور ایک بسکٹ کھایا۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ آنکھیں اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہیں۔

اس افراتفری میں گھنٹی بج گئی۔ مس فہمیدہ جاتے ہوئے کلاس مانیٹرز نور، عزہ، لائبہ اور ان کے علاوہ مجھے اینہ کا خیال رکھنے کی تاکید کر کے گئیں۔ ان کے جاتے ہی اینہ کی حالت مزید خراب ہونے لگی۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ ہر ایک کو رونا آ رہا تھا۔ نور کی آنکھیں آنسو روکنے کی تقریباً کامیاب کوشش میں لال سرخ ہو چکی تھیں۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

"پتا نہیں وہ دوبارہ دیکھ سکے گی یا نہیں؟"

آدھی چھٹی کے دوران ہم اینہ کو ڈسپنسری میں دیکھنے گئے۔ وہ بستر پر سو رہی تھی۔ اس کے گھر فون کیا گیا لیکن مصروفیت کی وجہ سے کوئی آ نہیں سکا۔ جب ہم جماعت میں پہنچے، اس وقت دانیہ نے مجھے بتایا کہ ارینا کے کزن کو بھی یہی تکلیف تھی۔ اسے اسپتال لے کر گئے تھے تو ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ یہاں اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹروں نے ارینا کے کزن کو لندن لے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ "یار! ایک تو یہاں کچھ ملتا ہی نہیں پاکستان میں۔ کچھ ہو جائے تو مسئلہ حل کرنے کے لیے باہر جانا پڑتا ہے۔ بہتر ہے کہ انسان امریکہ یا کینیڈا جا کر سیٹل ہو جائے۔ کم از کم ایسے مسائل تو نہ ہوں۔" دانیہ نے کہا۔

دانیہ کا یہ تسلیم کرنا ناممکن تھا لہٰذا میں خاموش ہو گئی۔ میں نے نرم لہجے میں سمجھانے کے انداز میں دانیہ کو سنا بھی دی تھیں مگر ایک غلط سوچ کو صحیح ثابت کرنے کا اس کا جوش پہلے ہی آسمان تک پہنچا ہوا تھا۔ اگر یہ جوش ذرا سا اور بڑھ جاتا تو شاید وہ اسی وقت ٹکٹ پاسپورٹ لے کر امریکہ چلی جاتی۔ خاموشی بہترین فیصلہ تھا۔

معزز قارئین! اگر پاکستان میں سہولیات نہیں تو اس میں پاکستان کا کوئی قصور نہیں۔ قصور سب ہمارا ہے۔ اگر ہمارے تعلیم یافتہ بچے باہر چلے جائیں گے تو ملک میں سہولیات کہاں سے آئیں گی؟ اگر نوجوان نسل اپنی قابلیت اور صلاحیتیں بیرون ملک کام میں لائیں گے تو اس سے پاکستان کو فائدہ کس طرح پہنچ سکتا ہے؟ اینہ تو ٹھیک ہو گئی ہے، سب کچھ دیکھ سکتی ہے مگر ہم نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ ہمیں حقائق اور اپنی غلطی نظر نہیں آتی، نظر آتا ہے تو صرف پاکستان کا قصور، حالانکہ پاکستان پاکستانیوں کے دم سے ہے اور پاکستانی ہم ہیں۔

پیارے بچو! اپنی سوچ کو منفی خیالات سے پاک رکھیے، اپنا محاسبہ کیجیے۔ پاکستان پر یقین رکھیے، یہ قائم رہنے کے لیے بنا ہے اور خوب محنت کیجیے اور پاکستان کی دل و جان سے خدمت کریں۔

نئے دنوں کی مسافتوں کو اُجالنا ہے
وفا سے آسودہ ساعتوں کو سنبھالنا ہے
امیدِ صبح جمال رکھنا، خیال رکھنا
خیال رکھنا، خیال رکھنا، خیال رکھنا

(دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

شکر

(احمد علی، مانسہرہ)

جون کے دن تھے۔ گرمی اپنے جوبن پر تھی۔ میں کالج سے تھکا ہارا گھر آیا۔ پنکھا چلایا اور لیٹ گیا۔ سخت دھوپ نے مجھے جھلسا دیا تھا۔ پنکھے کی ہوا جنت سے آتے جھونکوں کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ ابھی پسینہ بھی نہ خشک ہونے پایا تھا کہ بجلی چلی گئی۔ میں بے چینی کے عالم میں اُٹھ بیٹھا اور سر پکڑ لیا۔ "ہر تکلیف خدا مجھے ہی کیوں

دیتا ہے؟" میں جھنجلاہٹ میں بڑبڑانے لگا۔

آج کا دن بڑا خوش گوار گزرا۔ بس شام کے وقت ہلکی ہلکی سردی محسوس ہونے لگی۔ میں کمبل اوڑھ کر بستر میں دبک گیا مگر کپکپی بدستور جاری رہی۔ ابا مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ بخار کی شکایت تھی۔ دوا لے کر گھر آئے۔ کل میرے دوست تفریح کے لیے جا رہے ہیں جب کہ مجھے ڈاکٹر نے تین دن مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔ "کم بخت بخار نے بھی مجھے ہی چنا۔ خدا کو بھی مجھے ہی بیمار کرنا تھا۔"

"بیٹا میں نے دسترخوان پر کھانا پرو دیا ہے۔ جلدی آ کر کھا لو، ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔" ماں نے پیار سے کھانے کے لیے بلایا۔ میں ہاتھ دھو کر دسترخوان پر جا بیٹھا۔ مجھے کافی بھوک لگی تھی، مگر اگلے ہی لمحے بھوک رفو چکر ہو گئی جب امی نے پلیٹ میں دال ڈال کر میرے سامنے رکھی۔ "یہ کیا، ہزار بار کہا ہے مجھے دال نہیں پسند، نہ پکایا کریں۔ پھر کیوں دال بنائی؟" میں غصے میں امی کو دیکھ کر بولا۔ "مگر بیٹا یہ بھی اللہ کی نعمت ہے، شکر ادا کر کے کھا لو" امی پیار سے سمجھا کر بولیں، مگر میرے سر پر تو غصہ سوار تھا جیسے کھانے کے بجائے کسی نے منہ کے آگے زہر لا کر رکھ دیا ہو۔ میں نے امی کی بات کا جواب نہ دیا اور غصے سے بیرونی دروازہ زور سے مارتے ہوئے باہر چل دیا۔

میرے ایک عزیز کے دل کا آپریشن ہوا۔ ابا نے کہا، بیٹا صبح میرے دفتر اور تمہارے کالج کی چھٹی ہے تو ہم عیادت کے لیے چلے جائیں گے۔ ان صاحب کا آپریشن ساتھ والے شہر کے بڑے اسپتال میں ہوا تھا۔ چناں چہ ہم گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ اس دن بڑی سخت گرمی تھی اور لو چل رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ سورج تو شعلے برسا ہی رہا ہے، ساتھ میں زمین بھی آگ اُگل رہی ہے۔ شہر کے رستے میں کھیت پڑتے ہیں۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ضعیف العمر بزرگ پسینے میں شرابور ہیں اور اس تیز دھوپ میں ٹماٹر کے ایک کھیت میں جھکے ٹماٹر چن رہے ہیں۔ میں ان بزرگ کو اس وقت تک ٹکٹکی باندھے گھورتا رہا جب تک وہ میری نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔ میری آنکھوں سے آنسو تو نہ ٹپکے بہرحال مجھے اتنا محسوس ہو گیا تھا کہ میری آنکھوں میں کچھ نمی سی آ گئی ہے۔ میرے سامنے وہ منظر گھوم گیا جب ذرا سی بجلی جانے پر میرے منہ سے ناشکری کے کلمات نکلے تھے۔ میں خدا کے سامنے شرمندہ تھا جس نے مجھے بہت سے لوگوں کے حال سے بہتر رکھا، مگر پھر بھی میرے منہ سے شکایت کے الفاظ نکلے۔

میں اسی ندامت میں ڈوبا پڑا تھا کہ اسپتال آ پہنچا۔ مریض سے ملنے کے لیے ہمیں کچھ دیر انتظار کرنا تھا۔ ہم باہر بنچ پر بیٹھ گئے۔ وہاں سے کئی مریضوں کا گزر ہوا۔ کچھ کو وہیل چیئرز اور کچھ کو اسٹریچر پر جاتے دیکھا۔ کچھ کو بازوؤں یا ٹانگوں کے بنا دیکھا۔ ایک مرتبہ پھر سے میں خدا کے سامنے نادم تھا کہ صرف بخار ہونے کی وجہ سے میں نے اس کی ناشکری کی۔

بالآخر ہمارا مریض سے ملنے کا وقت آ گیا۔ ہم نے اندر جا کر ان کی عیادت کی۔ ان صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ کھانے پینے کے بڑے شوقین ہیں۔ اتنے میں ان کا بیٹا ان کے لیے کھانا لیے آ گیا اور انہیں کھلانے لگا۔ پرہیزی کھانا تھا اور مریض کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ زبردستی اسے کھا رہا ہے۔ یہ میرے لیے ندامت کا تیسرا جھٹکا تھا۔ مجھے وہ دسترخوان سے کھانا چھوڑ کر اُٹھ جانا اور والدہ سے بدسلوکی کرنا یاد آ گیا۔ میں واپسی پر پورا رستہ اپنے آپ کو کوستا رہا۔ گھر جا کر توبہ کے نفل پڑھے اور اللہ سے اپنی ناشکری کرنے کے لیے معافی مانگی۔ میں نے خود پر غور کیا تو اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے ہزاروں وجوہات نظر آئیں۔ اس دن کے بعد سے میں نے ناشکری سے توبہ کر لی اور ہر بات پر اللہ کا شکر ادا کرنا شروع کر دیا اور یقیناً اس کے بعد اللہ نے مجھ پر نعمتوں کی بارش اور زیادہ کر دی ہے۔

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

حسد بُری بلا ہے

(احمد عبداللہ، ملتان)

پیارے بچو! برسوں پہلے مظفر گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک نہایت محنتی اور شریف دینو حلوائی رہتا تھا۔ دینو کی حلوائی لذت اور ذائقے کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ تھی، مگر بدقسمتی سے دینو کے گھر میں خاک اُڑتی تھی اور مفلسی اور پریشانی کے ڈیرے تھے۔ وجہ صاف سمجھ آتی تھی کہ دینو کی بیوی سگھڑ اور سمجھ دار نہ تھی، وہ حاسد اور ناشکری عورت تھی۔ اس کے محلے میں سیٹھ عابد کا گھرانہ تھا، جن کی خوش حالی سے وہ بہت جلتی تھی۔ اس کا یہ حسد اسے کسی بھی پل چین نہیں لینے دیتا تھا۔ دینو اسے خدا کی مصلحتیں اور حکمتیں سمجھاتا، سمجھاتا تھک گیا مگر بے سود۔ دینو کہتا تھا کہ صفیہ بیگم! جتنی میری

آمدنی ہے اس میں ہم بہت خوش حال زندگی گزار سکتے ہیں، مگر تمہارا ناشکرا پن ہماری بے سکونی کا باعث بن رہا ہے، مگر اس عورت کو عقل نہ آتی تھی۔ اسی وجہ سے دن بدن گھر میں بے سکونی بڑھ رہی تھی۔ جب کوئی دُنیاوی تدبیر دینو کی بیوی کا دماغ درست نہ کر سکی تو قدرت کی طرف سے ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ جس نے دینو کی بیوی صفیہ بیگم کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن مٹھائی بنانے کے دوران گرم گھی کا کڑاہا دینو پر گر گیا۔ بے چارا دینو بُری طرح جھلس گیا اور گھر پر بیٹھ گیا۔ دُکان بند ہوگئی۔ کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ گھر میں فاقے ہونے لگے۔ اہلِ محلّہ نے اپنی بساط کے مطابق ان کی مدد کی۔ ایک دن سیٹھ عابد کی بیوی ان کے گھر آئی۔ اس نے دینو کی بیوی کو ایک معقول رقم دی اور دینو کے علاج معالجے کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے اس کو ایک چرخا بھی دیا تاکہ وہ دینو کے صحت یاب ہونے تک کم اَز کم چرخا کات کر گزر بسر کر سکے۔ دینو کی بیوی بیگم عابد سے بہت متاثر ہوئی اور آئندہ کے لیے حسد سے توبہ کرتے ہوئے صبر اور شکر سے زندگی گزارنے کا عہد کیا۔ (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

میں ہوں اقبالؒ کا شاہین

(خدیجہ مدثر، سیال کوٹ)

آپی آپ دیکھنا اس سال تو میں ''شاہین'' ایوارڈ لے کر رہوں گا۔ آخر سارا سال اتنی محنت کی ہے۔ سب سے زیادہ نظمیں یاد کی ہیں۔ اتنی فصیح و بلیغ تقریر تیار کی ہے۔ آپ دیکھنا میں ہی یہ مقابلہ جیتوں گا۔'' سولہ سالہ معراج اپنی آپی کو بتا رہا تھا۔ معراج دہم جماعت کا طالب علم تھا اور اسکول میں اچھے طالب علم کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ ہر سال کی طرح اس کے اسکول میں یوم اقبال کے موقع پر ''شاہین ایوارڈ'' دیا جانا تھا۔ معراج اسے پانے کے لیے اپنی کی گئی خصوصی تیاری بتا رہا تھا۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن یہ بتاؤ کہ تم نے سیکھا کیا ہے۔ شاہین پر شعر ہی رٹے ہیں یا خود میں اسے بیدار بھی کیا ہے؟'' آپی نے کہا۔

معراج پریشان ہو گیا اور آپی سے وضاحت طلب کرنے لگا۔

آپی بولیں۔ ''معراج! کیا تم واقعی شاہین ایوارڈ کے حق دار ہو؟ اگر تم پیپرز میں نقل نہیں کرتے، اپنے وطن کی خدمت کا عزم لیے تعلیم میں مصروف ہو، اس دیس کے مقدر میں روشنی بھرنے کے لیے اپنے حصے کا دیا پورے خلوص، ایمان داری اور سچائی سے جلا رہے ہو تو ''شاہین'' ہو۔ ورنہ یہ ایوارڈ بے کار ہے۔''

معراج خاموش تھا کیوں کہ وہ صرف اس ایوارڈ کے لیے ہی سب کر رہا تھا۔ آپی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اقبال کے خواب کی تعبیر یہ دیس ہمارے سپرد ہے۔ اقبال کو آج کے جوانوں سے امیدیں وابستہ تھیں کہ کسی بھی ملک کی ترقی کا انحصار اس کے جوان خون کی سرگرمی پر ہے۔ اس لیے اقبال نے نوجوان کو شاہین قرار دیا کہ وہ اپنے اندر ایسے اوصاف پیدا کرے۔ تم اگر عزم کرو کہ فکر اقبال کو پھیلاؤ گے اور تعلیمات اقبال پر عمل کرو گے تو ''شاہین'' کہلاؤ گے۔ گفتار کے غازی کی بجائے کردار کے غازی بنو۔ علم کی شمع سے محبت کرو اور اس چمن کی تزئین میں اپنا حصہ ڈالو، کیوں کہ عمل کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں۔''

معراج بات کو سمجھ رہا تھا۔ بولا: ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب اپنے کردار و اعمال کو ویسے بناؤں گا جیسے اقبال ''شاہین'' میں چاہتے تھے۔ میں بنوں گا اقبال کا اصلی شاہین۔'' اس کا لہجہ پُرعزم تھا۔

(پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

ہرمزان کی حیلہ سازی

ایرانی چیف ہرمزان مسلمانوں کا شدید دشمن تھا۔ اس نے مسلمانوں کو ختم کر دینے کی قسمیں بھی کھا رکھی تھیں۔ مسلمانوں کے ساتھ ایک جنگ میں وہ مسلمانوں کا قیدی بن گیا تھا۔ ہرمزان کو جب مدینہ منورہ میں حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے پیش کیا گیا تو اسے خدشہ تھا کہ اسے جلد ہی اس کی دشمنی اور شدید عداوت کے باعث قتل کر دیا جائے گا۔ اس موقع پر ہرمزان نے ایک ترکیب سوچی اور خلیفہ عمر بن الخطابؓ کے سامنے پینے کے لیے ایک گلاس پانی طلب کیا۔ جب پانی کا گلاس لایا گیا اور ہرمزان کو پینے کے لیے پیش کر دیا گیا تو ہرمزان نے وہ پانی پینے سے پس و پیش سے کام لیا۔ خلیفۃ المسلمین نے اس امر کی وجہ دریافت کی تو ہرمزان نے کہا کہ مجھے خدشہ ہے کہ مجھے پانی پیتے میں قتل نہ کر دیا جائے۔ ہرمزان کے اس خطرے اور خدشے پر حضرت عمر فاروقؓ نے اس سے وعدہ کر لیا کہ جب تک وہ پانی کا بھرا ہوا گلاس نہیں پی لے گا، اس وقت تک اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس وعدے پر ہرمزان نے بڑی چالاکی کے ساتھ پانی کا بھرا ہوا گلاس دُور پھینک دیا اور کہا کہ مسلمانوں کے خلیفہ نے میرے ساتھ پانی کا گلاس پینے تک قتل نہ کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ اس لیے میں یہ پانی نہیں پیوں گا اور مجھے یقین ہے خلیفہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے وعدے کی پاسداری کرتے ہوئے اور ہرمزان کی جان بچانے کی حیلہ سازی پر اسے قتل نہ کیا۔ کہا جاتا ہے حضرت عمر بن الخطابؓ کے اس عمل کو دیکھ کر اور مسلمانوں کے وعدے کی پاسداری کو دیکھتے ہوئے ہرمزان نے اسلام بخوشی قبول کر لیا تھا۔

(محمد عمر عثمان، جھنگ صدر)

محکمے کے ٹول فری نمبر پر کسی شہری کی طرف سے ایک کال موصول ہوئی تھی۔ اس شہری نے اپنا تعارف نہیں کرایا تھا۔ محکمے کے لیے اس شہری کے نمبر سے اس کا تعارف حاصل کرنا چنداں مشکل نہیں تھا مگر اس وقت تعارف سے زیادہ دی جانے والی خبر ان کے لیے بہت اہم تھی۔ دفتری عملے نے لمحوں میں اپنی تیاری مکمل کی تھی اور پھر منتخب ٹیم سرکاری گاڑی میں اپنے ہدف کی طرف روانہ ہوئی۔ گاڑی میں موجود عملہ بہت پُرجوش تھا۔ سب اپنی اپنی کہہ رہے تھے۔

''ہمارے پاک وطن کو یہ لوگ دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ اب ہم کسی کو نہیں چھوڑیں گے......''

''ایسے لوگوں کی وجہ سے ہی تو ہمارا ملک مستحکم نہیں ہو پایا۔ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔''

''ایسے لوگوں کی وجہ سے امیر...... امیر ہوتا چلا جا رہا اور غریب......غریب تر۔''

''ایسے لوگ اپنا روپیہ دوسرے ممالک کے بینکوں میں رکھتے ہیں۔ ان روپوں سے وہ ممالک خوش حالی کی راہ پر گامزن ہیں اور پاک وطن اس سرمائے سے محروم ہے اور ترقی نہیں کر پا رہا۔''

''ایسے لوگ برتن کا چھید ہیں۔ اب ہم ان چھیدوں کو بھر کر ہی رہیں گے۔''

''ایسے لوگوں کی وجہ سے ملک میں توانائی کا بحران ہے......''

سرکاری گاڑی نے ایک موڑ کاٹا۔ اب پولیس موبائل بھی ان کے ساتھ آ رہی تھی۔ اس چھاپے میں پولیس کا ساتھ ہونا بہت ضروری تھا۔ اب یہ دونوں گاڑیاں ایک کچی بستی میں داخل ہوئیں۔ یہاں کچھ جگہوں پر تعمیراتی کام جاری تھا۔ واپڈا اور پولیس کے عملے کو دیکھ کر لوگ چہ مگوئیاں کرنے لگے تھے۔ آگے راستہ نسبتاً تنگ تھا۔ گاڑیاں رُک گئیں۔ اب عملہ برق رفتاری سے پیدل ہی آگے کی طرف بڑھا۔ پھر وہ سب اس مکان کے سامنے پہنچ گئے جہاں پر بجلی چوری کی اطلاع ملی تھی مگر یہاں ایک ہنگامہ ان کا پہلے سے منتظر تھا۔

ایک غصیلے آدمی نے ایک خستہ حال آدمی کا گریبان پکڑ رکھا تھا۔ چند بچے اس خستہ حال آدمی کے اطراف میں کھڑے رو رہے تھے۔ ایک عورت دروازے کے ساتھ لگی آنسو بہا رہی تھی۔

''رحم کرو...... خدا کے لیے...... رحم کرو۔'' وہ خستہ حال آدمی فریاد کر رہا تھا۔ اس کا نام مشتاق تھا۔ سرکاری اہل کاروں کو بھی یہی نام بتایا گیا تھا۔

''تم نے تین ماہ کا کرایہ نہیں دیا اور رحم کی بات کرتے ہو۔'' وہ غصیلہ آدمی دھاڑا تھا۔ ''نکل جاؤ یہاں سے...... ورنہ دھکے مار کر تم سب لوگوں کو یہاں سے نکال دوں گا۔'' وہ مالک مکان تھا۔

''ہم نے کچھ رقم جمع تو کروائی تھی۔'' مشتاق کی آواز میں درد موجود تھا۔

''وہ رقم کرائے کی مد میں کٹ گئی۔ اب اپنا راستہ ناپو۔''

مالک مکان پتھر دل تھا۔ اسے روتی ہوئی عورت اور بچے نظر نہیں آ رہے تھے۔

''ہم لوگ در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ خدا کے لیے...... خدا کے لیے۔''مشتاق نے آخری بار التجا کی تھی۔

''جہنم میں جاؤ تم لوگ۔ مالک مکان نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ اب واپڈا اہل کار آگے بڑھے تھے۔

''رُکو! ہم مشتاق کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔ اطلاع ملی ہے کہ یہ بجلی چور ہے۔''

''لو اور سنو۔'' مالک مکان نے طنز کیا تھا۔ اب اہل کار مکان میں داخل ہو گئے تھے۔ وہ بجلی چوری کی تصدیق کرنا چاہتے تھے۔ مکان میں سہولت کا کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ بس ایک پھٹیچر سا پنکھا چھت کے ساتھ لٹک رہا تھا اور ایک بلب ان سب کا منہ چڑا رہا تھا۔ آج ایک مجبور چور ان کے ہاتھ لگا تھا، مگر ان کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ مشتاق کو گرفتار کریں۔

''میں نے تو ویسے بھی اسے مکان سے نکال دیا ہے۔ آپ گرفتار کر لیجیے اسے۔'' مالک مکان بولا تھا۔

''ایک بدحال آدمی کو گرفتار کر کے ہم کیا کریں گے۔'' ایک اہل کار دکھ سے بولا تھا۔ جانے کیوں اس کے دل میں مشتاق کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ اب مشتاق آگے بڑھا، اس نے اپنے دونوں ہاتھ باندھ رکھے تھے۔

''جناب! آپ مجھے گرفتار کر لیجیے، مجھے جیل میں ڈال دیجیے، اب میں بہت تھک چکا ہوں۔ مجھ سے زندگی کی مشکلات کا بوجھ اُٹھایا نہیں جاتا۔ میرے بچوں اور بیوی کو کسی ایسی جگہ چھوڑ دیجیے جہاں انہیں دو وقت کا کھانا مل جائے۔ ہمیں گرفتار کر لیجیے۔ خدا کے لیے...... خدا کے لیے......'' سرکاری اہل کاروں کے لیے اب جان چھڑانا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اب واپسی کے لیے قدم اٹھانے لگے تھے۔ مشتاق ان کے پیچھے آ رہا تھا۔

''ہمیں گرفتار کر لیجیے...... خدا کے لیے۔'' اتنی دیر میں مالک مکان نے گھر کے دروازے پر اپنا تالا لگا دیا تھا۔ تالا لگانے کے بعد وہ بھی رفو چکر ہو گیا تھا۔ اب گلی میں مشتاق کی بیوی اور بچوں کے سسکنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ تمام گھروں کے دروازے بند تھے۔ کوئی بھی ان کی مدد کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ پھر مشتاق سر جھکائے واپس لوٹ آیا۔ بچے اس سے لپٹ گئے۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر موجزن تھا۔ پھر وہ سب ایک نامعلوم منزل کی طرف چل پڑے۔

مشتاق اس معاشرے کا ایک مفلس انسان تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی مشقت میں گزار دی تھی اور اب اس کی ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ شام ہونے تک وہ شہر سے نکل کر کچے کے علاقے میں داخل ہو چکے تھے۔ یہاں ہوا خنک تھی۔ دریا کی طرف سے آتی ہوا میں زندگی کا پیغام تھا لیکن مشتاق کے لیے تمام جذبات اور احساسات بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے بچے بھوک کی شدت سے بلک بلک کر رو رہے تھے۔ اس کی بیوی ایک صابر عورت تھی لیکن ان دونوں سے بچوں کی تکلیف دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ رات کا اندھیرا چار سو پھیل چکا تھا۔ روتے بلکتے بچے جانے کب سو گئے تھے۔ وہ سب کھلے آسمان کے نیچے پڑے تھے۔ مشتاق کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ پتھرائی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ستارے ٹم ٹما رہے تھے۔ چودھویں رات کا چاند اپنے جوبن پر تھا اور مشتاق کی آنکھوں سے آنسو لڑھک رہے تھے۔ پھر کچھ سوچ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک نظر اپنے بچوں کی طرف دیکھا۔ بچے اپنی ماں کے ساتھ لپٹے سو رہے تھے۔ اب مشتاق کے منہ سے ایک سرد آہ نکل گئی۔ وہ ان کے لیے کچھ بھی تو نہیں کر پایا تھا۔ پھر وہ قدم اُٹھانے لگا۔ وہ دریا کی سمت میں چل رہا تھا۔ اب اس کے کانوں سے دریا کی لہروں کا شور ٹکرانے لگا تھا۔ پھر وہ کنارے پر آ کھڑا ہوا۔ یہاں دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا۔ پانی میں لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ مشتاق نے دو قدم آگے بڑھائے تو دریا کی لہریں اس کے قدموں کو چھونے لگیں۔ وہ دو قدم اور آگے بڑھا۔ اب وہ پانی کی ٹھنڈک کو محسوس کر رہا تھا۔ لہریں بہت تند تھیں۔ وہ کنارے سے ٹکراتی تھیں اور واپس لوٹ جاتی تھی۔ مشتاق یہاں اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کے لیے آیا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ دو قدم اور آگے بڑھاتا، ایک زور کی لہر آئی اور کوئی چیز مشتاق کے قدموں میں تڑپنے لگی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مشتاق گھبرا گیا۔ پھر مشتاق نے غور سے

دیکھا۔ یہ ایک بڑی سی مچھلی تھی۔ وہ پانی کے بغیر تڑپ رہی تھی اور اب شاید اس انتظار میں تھی کہ دوسری لہر آئے اور اسے اپنے ساتھ لے جائے، مگر دوسری لہر نہیں آئی۔ مچھلی نے تڑپ تڑپ کر مشتاق کے قدموں میں جان دے دی۔ مشتاق نے دریا کی طرف دیکھا، پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آج تک وہ لوگوں سے خدا کے لیے مانگتا رہا تھا مگر کسی نے کچھ نہیں دیا۔ اور آج خدا نے بغیر مانگے خود اسے بہت کچھ دے دیا تھا۔ اس نے جھک کر مچھلی اُٹھا لی۔ اب وہ خوشی خوشی واپس لوٹ رہا تھا۔ اس کی بیوی اور بچے بے سدھ سو رہے تھے۔ پھر اس نے اپنی بیوی کو جگایا۔

''اُٹھو...... اس مچھلی کی آلائشیں صاف کرو۔ اتنی دیر میں ایندھن لے کر آتا ہوں۔ خدا نے ہمارے لیے کھانا بھیج دیا ہے۔'' غم سے روتی اس کی بیوی اب خوشی سے رو پڑی تھی۔ مشتاق درختوں کی خشک شاخیں توڑنے لگا تھا۔ بچے بھی نیند سے جاگ پڑے تھے۔ اب وہ مچھلی کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ پھر مشتاق نے آگ جلائی۔ آگ پر مچھلی کو بھونا گیا۔ سب نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اب مشتاق ایک نئے عزم کے ساتھ دریا کی سمت بڑھا۔ لہریں اب بھی مچھلیوں کو باہر پھینک رہی تھیں اور مشتاق انہیں سمیٹنے میں لگا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ جب وہ مچھلیوں سے لدا پھندا دریا سے واپس لوٹا تو صبح کا اُجالا پھیل رہا تھا۔ اس نے ایک کے بعد ایک ان تمام مچھلیوں کو رسیوں میں پرو لیا۔ ان تمام رسیوں کو اس نے ایک ڈنڈے کے ساتھ باندھ لیا۔ اب اس ڈنڈے کو اپنے کندھے کے وسط میں رکھ کر وہ شہر کی طرف چل دیا۔

جب وہ شہر سے آیا تھا تو وہ ایک مایوس اور مفلس آدمی تھا اور اب وہ آنے والے وقت کا سوداگر تھا مگر ابھی تو اسے پھیری لگانا تھی۔ وہ شہری حدود میں داخل ہوا اور پھر اس نے آواز لگائی۔

''تازہ مچھلی...... دریا کی مچھلی......'' لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ اس سے مچھلیاں خرید لیں تھیں۔ کام یابی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اب ان کے سر پر چھت بھی موجود تھی۔ پیٹ بھر کر کھانے کو بھی موجود تھا اور مشتاق نے اپنا جال بھی خرید لیا تھا۔ وہ ایک کھٹارہ سائیکل کے پیچھے موجود ٹوکرے میں مچھلیاں فروخت کرنے لگا تھا۔ بچے اسکول جانے لگے تھے۔ اب مشتاق میں ایک تبدیلی یہ آئی تھی کہ اس نے ''خدا کے لیے'' کہنا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ براہِ راست خدا سے مانگتا تھا۔ خدا کے ساتھ اس کا لگاؤ اب عشق بن چکا تھا۔

ایک دن پھیری لگاتے ہوئے وہ ایک گلی میں داخل ہوا۔ پھر وہ چونک پڑا۔ یہ تو وہی گلی تھی، وہی گھر تھا جہاں اس نے اپنے بچوں کے ہمراہ تین ماہ گزارے تھے۔ اب اس گھر میں کوئی نیا کرائے دار رہ رہا تھا۔ پُرانی یادیں تازہ ہوئیں تھیں تو وہ اس گھر کے سامنے رُک گیا۔ گھر کے اندر سے بچوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''جانے کیا ماجرا ہے۔'' وہ سوچنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ غریبوں کی بستی تھی۔ کم آمدنی والے جس انسان کو کہیں پناہ نہیں ملتی اسے یہاں کرائے پر چھت مل جاتی تھی۔ وہ سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

''اس گھر میں کوئی ایسا ہی انسان رہ رہا ہے جس کے حالات میرے جیسے ہوں گے۔''

بچوں کے بلکنے کی آوازوں میں اب تیزی آ گئی تھی۔ اب ان آوازوں میں کسی عورت کی آواز بھی شامل ہو گئی تھی۔ ''مچھلی...... تازہ مچھلی...... دریا کی مچھلی۔'' مشتاق نے آواز لگائی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بچوں نے پھر سے رونا شروع کر دیا تھا۔

''دریا کی مچھلی...... تازہ مچھلی۔'' اس بار مشتاق کی آواز بلند تھی۔ فوراً ہی ایک بے چین صورت آدمی گھر سے باہر نکلا اور قدرے سخت لہجے میں بولا۔

''بابا تنگ مت کرو...... ہمیں نہیں لینی مچھلی۔'' مشتاق نے دیکھا۔ منڈیر پر اسے چند بچے جھانکتے ہوئے نظر آئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں بھوک نظر آ رہی تھی۔ مشتاق نے اپنے ٹوکرے میں سے ایک بڑی سی مچھلی نکال کر اس آدمی کی طرف بڑھا دی۔

''کہا نا بابا...... مچھلی نہیں چاہیے؟'' ایک لمحے کے لیے مشتاق کو اس آدمی کی آنکھوں میں بھی بھوک کی چمک نظر آئی تھی۔

''لے لو......'' مشتاق نے پیار سے کہا۔

''میرے پاس پیسے نہیں ہیں؟ وہ آدمی درد بھری آواز میں بولا۔

''میں یہ مچھلی پیسوں کے لیے نہیں دے رہا۔''

''تو پھر کیوں دے رہے ہو؟''

''خدا کے لیے۔'' جانے کیوں کہتے کہتے مشتاق سسک پڑا تھا۔ اس آدمی کی آنکھوں کے کنارے بھی بھیگنے لگے تھے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے مچھلی تھام لی تھی اور مشتاق آگے بڑھ گیا۔ ☆☆

1- ڈبیا سے نکلا جس نے بھی کھولی
چاندی کا پانی ، سونے کی گولی

2- لال گائے کبھی نہ نہائے
اگر نہائے تو مر جائے
(مائرہ حنیف، بہاول پور)

3- جب دیکھو پانی میں پڑا ہے
پانی بہتا ہے وہ کھڑا ہے

4- اس نے سب کے کام سنوارے
ورنہ ہوتے احمق سارے
(عدن سجاد، جھنگ)

5- ہے پانی وہ ایسا
نہ اُگلے آسمان نہ نکلے زمین

6- موٹا پتلا سب کو بھائے
سو میٹھوں کا نام دہرائے
(فاطمہ اکرم، لاہور)

7- ڈاکٹر ہے وہ بن بلائے آئے
رات کو روز مفت ٹیکہ لگا جائے

8- تیلی کا تیل کمہار کا ہنڈا
ہاتھی کی سونڈ نواب کا جھنڈا

9- کہہ دیں اس کو آتا جاتا
نہ وہ جاتا ہے نہ آتا
(حافظ حامد و زوار الرحمٰن)

جوابات: 1- انڈا 2- آگ 3- پانی میں عکس 4- عقل 5- پسینہ 6- شکر قندی 7- مچھر 8- چراغ 9- راستہ

راستہ بتایئے

یہ تین راستے ہیں۔ آپ کس راستے سے چائے کی میز تک پہنچیں گے؟

کسی اور سے مت پوچھیے

ذرا ذہن پہ زور دیں پھر بھی پتا نہ چلے تو نمبر ملا لیں!

مدیر تعلیم و تربیت، السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

مخلص ہوں دشمن پہ بھی کرتا ہوں بھروسا
تا عمر مجھے جینے کے آداب نہ آئے

اس شعر میں مَیں نے اپنی شخصیت کو قلم بند کر دیا۔ زہے نصیب یقین تو تھا کہ خط شائع ہو گا لیکن اس کے بعد کیفیت کچھ یوں ہو گی کہ دن میں سو بار پڑھوں گی، پتا نہ تھا۔ بھئی اپنی اردو پر بھروسا بہت اور خط کے معاملے میں تو مرزا غالب کی جانشیں ہوں (بقول خود) حالانکہ ان کے خطوط ایک آنکھ نہیں بھاتے مجھے اور یاد کرنا تو سب سے اوکھا کام ہے جی، مگر کیا کریں سلیبس کا حصہ ہیں۔ واہ! مزہ آ گیا نہم کا رزلٹ جمعۃ المبارک کو آیا اور میرے لیے مبارکیں لایا۔ 515 نمبر لے کر خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ خیر میری محنت سے زیادہ سب کی دعاؤں کا ثمر ہے، مجھے تو یہی لگتا ہے۔ اوہ! یہ کیا اپنے بارے میں ہی کہے جا رہی ہوں۔ چلیں پھر پیاری سی بھولی سی حفصہ کی طرف سے تعلیم و تربیت کے لیے:

وہ آئے ہمارے گھر خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو دیکھتے ہیں اور کبھی اپنے گھر کو

سب کی خوشیوں کے لیے ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ، اللہ حافظ!

(حفصہ یاسر گوندل، گوجرانوالہ)

☆ اتنا خوب صورت خط لکھنے کا بہت شکریہ۔ ہماری طرف سے بھی آپ کو اچھے نمبر لینے پر مبارک ہو اور مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو ہیں۔

میرا نام شاہ زیب علی ہے اور میں بھلوال میں رہتا ہوں۔ میں پانچ سال سے تعلیم و تربیت کا خاموش قاری ہوں۔ زندہ لاش، خیر ہے نوٹینشن نے اس مہینے کا مزہ دوبالا کر دیا۔ آپ کرکٹ کے بارے میں معلومات رسالے میں شائع کریں، ورنہ میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گا۔ میں نے یہ خط پہلی بار لکھا ہے اور اسے ضرور شائع کیجیے گا۔ (شاہ زیب علی، بھلوال)

☆ آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ کرکٹ پر ہم بہت کچھ شائع کر چکے ہیں۔

ایڈیٹر صاحب! اُمید ہے تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم خیریت سے ہو گی۔ میں پہلی دفعہ خط لکھ رہا ہوں۔ اُمید ہے ردی کی ٹوکری کی نظر نہیں ہو گا۔ سب سے پہلے ایک انڈہ ایک نوالہ، چندن ترکھان اور دیگر کہانیاں پڑھیں، بہت پسند آئیں۔ کھڑکھاند گروپ کی غیر حاضری بہت محسوس ہوئی۔ یہ سلسلہ ختم نہ کریں۔ تعلیم و تربیت زمین و آسمان پر چمکتا رہے۔ (آمین!) (محمد خان، بلقیس فاطمہ نیازی، موچھ)

ڈیئر ایڈیٹر صاحب! تعلیم و تربیت کے لیے میرا پیغام!!!

اُمید پہ دُنیا قائم ہے محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔

یہ میرا پہلا خط ہے اس کو ضرور شائع کریں۔ اس ماہ کے شمارے میں نہ کر سکیں تو اگلے شمارہ میں میری تحریر ضرور شائع کریں۔ تعلیم و تربیت سے میرا رشتہ بہت پُرانا ہے۔ میں اس کو سال 2000ء سے مسلسل پڑھ رہی ہوں۔ گھر میں ہم سب بہن بھائی کا اکلوتا ہے۔ ہر کوئی سب سے پہلے اس کو پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اوجھل خاکے، میری زندگی کے مقاصد، درسِ قرآن اس کے علاوہ بہت سی معلومات ہوتی ہیں۔ ایڈیٹر صاحب! آپ سے گزارش ہے کہ چچا حیرت، چچا تیز گام، صوفی نیازمند اور پُرانی کہانی راجو والی (سیلاب کہانی) ان کو دوبارہ شائع کیا جائے۔ آج میرا فورتھ سمسٹر کا پہلا پیپر ہے۔ آپ نے دعا کرنی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اچھے نمبروں سے کامیابی دے اور اپنی محنت کے بل بوتے پر مجھے ائیرفورس میں جگہ مل جائے۔ میں بہری طالبہ ہوں میری آواز چھٹی جماعت سے چلی گئی تھی ٹائیفائیڈ کے ساتھ، پھر بھی اللہ کا شکر ہے کہ ماسٹر کر رہی ہوں اپنے والدین کی دعاؤں کے ساتھ۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

(عائشہ خالد اعوان، حویلیاں)

☆ آپ کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

السلام علیکم، ایڈیٹر صاحب! کیسی ہیں آپ! میں مسلسل تین سال سے تعلیم و تربیت بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور یہ میرا پہلا خط ہے۔ پلیز! شائع کیجیے گا۔ ہمارے گھر میں یہ رسالہ بہت شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ خاص طور پر میری والدہ اپنے بچپن سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہیں۔ اگر آپ نے میرا خط شائع کیا تو میرے والدین کو بہت خوشی ہو گی۔ میں چاہتی ہوں کہ میں اچھی سے اچھی کہانی لکھ کر بھیجوں لیکن مجھے معلوم نہیں ہے کہ کہانی کس طرح بھیجتے ہیں۔ اُمید کرتی ہوں کہ میرا خط ردی کی ٹوکری کی زینت نہیں بنے گا۔ مجھے بہت دکھ ہو گا۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی دے۔ (آمین!) (نجیبہ شاہد، کراچی)

☆ آپ ڈاک کے ذریعے کہانی بھیجیں، پھر ہم سے رابطہ کیجیے۔

محترم جناب ایڈیٹر صاحب! آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ میرا نام جویریہ غوری ہے اور میں نے پہلی بار آپ کے ادارے کا رسالہ پڑھا جو پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ بہت سی معلومات ملیں اور کہانیوں کی صورت میں سبق آموز باتیں سیکھنے کو ملی ہیں۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ اُمید کرتی ہوں کہ میری حوصلہ افزائی ضرور کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ اس ادارے کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے۔ ادارے سے منسلک افراد ہمیشہ خوش رہیں، آباد رہیں۔ (جویریہ غوری، بہاول پور)

☆ آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں اور دعاؤں کے لیے بہت شکریہ۔

اُمید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ میں دسویں جماعت کی طالبہ ہوں۔ میں تقریباً ایک سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں لیکن خط لکھنے کی ہمت پہلی بار کی ہے۔ اکتوبر کا رسالہ بہت اچھا تھا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ اُمید کرتی ہوں کہ آپ میرا پہلا خط ضرور شائع کریں گے۔ (سمیعہ توقیر، کراچی)

میرا نام عبدالسلام مشتاق محمد ہے اور میں باڑہ ہملٹ محلہ اعزاز آباد میں رہتا ہوں۔ میں تین سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہوں۔ یہ بہت ہی اچھا میگزین ہے۔ ''چندن ترکھان اور عقل مند بہو'' بہت ہی دل چسپ کہانی تھی۔ خط لکھنے کی ہمت پہلی بار کر رہا ہوں۔

برائے مہربانی فرما کر اگر میرے خط کے لیے جگہ نہ بچے تو میرا نام ضرور شائع کیجیے گا۔ شکریہ! (عبدالسلام مشتاق محمد، باڑہ ہملٹ)

تعلیم و تربیت کا شمارہ خوب صورت سرورق اور دیدہ زیب مضامین کے ساتھ نظر سے گزرا۔ شہر حیدر آباد میں رسالہ جلدی پہنچا دیا کریں۔ رسالہ پندرہ تاریخ کے بعد پہنچتا ہے اور جب تک خط بھیجنے کی تاریخ ختم ہو جاتی ہے۔ برائے مہربانی میری شکایت غور سے پڑھیں اور اس پر توجہ دیں۔ میں تعلیم و تربیت شوق سے پڑھتی ہوں اس لیے اتنا بڑا خط لکھ کر بھیج رہی ہوں اور میں اپنی یہ شکایت پہلے بھی کئی دفعہ کر چکی ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میری شکایت پر ضرور غور کریں گے۔ (شیرونیہ شاہ، حیدر آباد)

اس ماہ کا شمارہ بہت شاندار تھا۔ کہانیوں میں ایک انڈا ایک نوالہ، خیر ہے ٹوٹینشن، برف کی ملکہ، ہائے اللہ سانپ!، بے نور نے تو دل کو خوش کر دیا۔ حضرت بایزید بسطامیؒ، آبِ زم زم کے کنویں کی تعمیر، سر سید احمد خان نے تو رسالے کو چار چاند لگا دیے۔ محاورہ کہانی بھی اچھی تھی۔ آیئے مسکرایئے نے تو پیٹ میں درد کر دیا۔ او جھل خاکے بہت اچھا سلسلہ ہے، اسے جاری رکھیے گا۔ میں آیئے مسکرایئے میں لطیفے کیسے بھیج سکتا ہوں؟ پلیز، اس بار میرا خط ضرور شائع کیجیے گا، ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی دے۔ (آمین!) (محمد حسن محمود، لاہور)

☆ جی ہاں! آپ لطیفے بھیج سکتے ہیں۔

ڈیئر ایڈیٹر صاحب! اس ماہ کا رسالہ سپرہٹ تھا۔ سرورق پر پیاری پیاری اور خوب صورت تتلیاں بہت زیادہ اچھی لگ رہی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کے متعلق مضمون سے بہت زیادہ معلومات حاصل ہوئیں۔ کہانیوں میں ایک انڈا ایک نوالہ، چندن ترکھان، حماقتیں اور بے نور تو زبردست تھیں۔ زومبی ناول بہت تجسس بھرا ہے۔ میں ایک کہانی بنام گائے کی سہیلی بھیج رہا ہوں، اگر معیاری ہوئی تو ضرور شائع کریں۔ یہ کہانی آپ بھی لکھیے کے لیے نہیں ہے۔ اگر میرے خط کے لیے جگہ نہ بچے تو میرا نام ضرور شائع کیجیے گا۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی رات چگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

پیاری پیاری معلومات کا آسمان ہے تعلیم و تربیت
بچوں کے اس باغ کا باغبان ہے تعلیم و تربیت
(سید محمد عثمان، عمر نفیس، گوجرانوالہ)

☆ ہم نے تو آپ کا پورا خط ہی شائع کر دیا ہے۔ اب آپ خوش ہیں؟

ڈیئر ایڈیٹر صاحب! اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں تعلیم و تربیت کا مسلسل ایک سال سے خاموش قاری ہوں۔ آج پہلی بار خط لکھ رہا ہوں۔ پلیز! اسے ضرور شائع کیجیے گا۔ اوہو! میں آپ کو اپنا تعارف کروانا تو بھول ہی گیا۔ میرا نام حذیفہ مشرف ہے اور میں ساتویں جماعت کا طالب علم ہوں۔ تعلیم و تربیت ایک زبردست اور عمدہ رسالہ ہے۔ میں پہلی تاریخ سے پہلے ہی اسے خریدنے چلا جاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی رات چگنی ترقی دے۔ (آمین!) (حذیفہ مشرف)

ان ساتھیوں کے خطوط بھی بہت مثبت اور اچھے تھے، تاہم جگہ کی کمی کے باعث ان کے نام شائع کیے جا رہے ہیں:
ثمن رؤف، محمد اسلم، لاہور۔ اسد اللہ ناصر، محمد احمد خان غوری، عمران خان غوری، بہاول پور۔ محمد ریان، اسلام آباد۔ اُم کلثوم، چتوکی۔ محمد حارث نعیم، علینا اختر، کراچی۔ ماہ رُخ ناصر، نمرہ اختر، سرگودھا۔ اسامہ ظفر راجا، سرائے عالم گیر۔ حبہ رحمٰن، اکوڑہ خٹک۔ طلحہ خباب علی، چیچی۔ عیشہ فاطمہ، فیصل آباد۔ حفیظ اللہ قیصرانی، روڈا قبہ۔ شائلہ ناز، محمد ضیاء اللہ، میانوالی۔ ایمان علی، مریم رضوان، راول پنڈی۔ عامر علی، لاہور۔

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود!
مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں، کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیمؑ و خلیلؑ
تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز
ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز
کعبۂ اربابِ فن! سطوتِ دینِ مبین
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں، آسماں
آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

قرطبہ (Cordoba) اسپین کا مشہور شہر ہے جو مسلم عہدِ حکومت میں صدر مقام تھا۔ قرطبہ 711 عیسوی میں مسلمانوں کے قبضے میں آیا۔ عبدالرحمٰن اوّل نے اسے دارالحکومت بنایا اور قرطبہ کی تاریخی جامع مسجد کی بنیاد رکھی۔ اس مسجد کا نقشہ بھی خود عبدالرحمٰن اوّل نے بنایا۔ وہ مسجد کی تعمیر کے دوران روزانہ کچھ وقت مزدوروں کے ساتھ مل کر مسجد کی تعمیر کا کام کیا کرتا تھا۔ عبدالرحمٰن اوّل کی وفات 788 عیسوی کے بعد اس کے بیٹے ہشام نے مسجد کی تعمیر کا کام جاری رکھا اور پھر تمام اموی بادشاہ مسجد میں توسیع کرتے رہے۔ یہ عظیم الشان مسجد، جو اب گرجا گھر میں تبدیل ہو چکی ہے، کبھی مسلمانوں اور اسلام کے جلال و جمال کا بے مثال نمونہ تھی۔ مسجد کا طول 620 فٹ اور عرض 440 فٹ تھا۔ ایک وسیع مسقف تھا جس میں 1417 ستون تھے جن میں عکس نظر آتا تھا۔ مختلف دیواروں میں 21 دروازے تھے، جن پر پیتل کا کام کیا گیا تھا۔ مینار کی بلندی 108 فٹ تھی جس کی چوٹی سونے چاندی کے گولوں سے مزین تھی۔ یہ سونے چاندی کے گولے سورج کی کرنوں سے میلوں دور سے چمکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ روشنی کے لیے 280 بلوری جھاڑ تھے۔ سب سے بڑے جھاڑ میں 1400 موم بتیاں جلتی تھیں۔ دیواروں میں پیتل کے سات ہزار چار سو پچیس پیالے تھے جن میں تیل بتیاں موجود تھیں۔ مقصورہ کے تمام ستون لاجورد کے بنے ہوئے تھے اور تمام دروازے سونے چاندی کے تھے۔ منبر آبنوس، صندل اور ہاتھی دانت کے چھتیس ہزار ٹکڑوں کو سنہری کیلوں سے جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ یہ مسجد عجوبۂ روزگار تھی اور مسلمانوں کے جمال و جلال کا مظہر تھی۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کہتے ہیں کہ ”مسجدِ قرطبہ ایک جلیل

القدر قوم کی جفاکشی، جاں بازی، مہم جوئی اور بلند خیالی کی زندہ تصویر ہے۔" علامہ اقبالؒ نے اس مسجد کی زیارت کے بعد شیخ محمد اکرام کے نام ایک خط میں لکھا کہ "مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایک ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔" یوسف سلیم چشتی نے علامہ اقبالؒ کے حوالے سے یہ بات لکھی ہے کہ "یہ مسجد قرآن پاک کی ایسی تفسیر ہے جو پتھروں کے ذریعے لکھی گئی ہے۔" علامہ نے اپنے بیٹے جاوید کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ "میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ میں اس مسجد کے دیکھنے کے لیے زندہ رہا۔ یہ مسجد دُنیا کی تمام مساجد سے بہتر ہے۔ خدا کرے تم جوان ہو کر اس عمارت کے انوار سے اپنی آنکھیں روشن کرو۔"

1931ء میں علامہ اقبالؒ نے جب اس مسجد کی زیارت کی، اس وقت اس کی عظمت کو زائل ہوئے پانچ سو سال گزر چکے تھے۔ انہوں نے یہاں اذان بھی کہی اور نماز بھی ادا کی۔ علامہ نے مسجد میں پہنچ کر یہاں کے نگران سے نماز ادا کرنے کی اجازت طلب کی تو اس نے کہا کہ میں بڑے پادری سے پوچھ کر آتا ہوں، لیکن اقبال پر جذبات کا ایسا غلبہ تھا کہ اس کے آنے سے پہلے ہی انہوں نے نماز ادا کر لی۔

علامہ اقبال نے اس نظم "مسجدِ قرطبہ" میں جو موضوعات پیش کیے ہیں، ان میں فلسفۂ فنا و بقا، زمان و مکاں، وقت، نظریۂ فن، عشق، مردِ مومن، جلال و جمال، ہسپانیہ میں مسلمانوں کی شان و شوکت اور احیائے اسلام وغیرہ نمایاں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر چیز مائل بہ فنا ہے، وقت کا دھارا ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے لیکن وہ نقش رنگِ دوام کے حامل ہیں، جنہیں کسی مردِ خدا نے تمام کیا ہو۔ مردِ خدا کا عمل عشق سے فروغ حاصل کرتا ہے اور عشق اصل حیات ہے، اس پر موت حرام ہے۔ مسجدِ قرطبہ بھی جمیل و جلیل ہے۔ نظم کے آخر میں اقبال احیائے اسلام کے بارے میں فکر مند ہیں اور وہ مختلف قوموں خصوصاً جرمنوں اور فرانسیسیوں کے انقلابات کی روشنی میں بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جرمن، فرانس اور اٹلی وغیرہ کے انقلابات سے ظاہر ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ کے امکانات بھی موجود ہیں۔ بہرحال اقبال بڑی اُمید سے آنے والے زمانے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب!

800 سال بعد مسلمانوں کی سلطنت ختم ہوئی تو عیسائیوں نے بہت جشن منائے۔ فرڈیننڈ عیسائی حکمران نے مسجد قرطبہ کو مسمار کرنا چاہا، کیوں کہ اب اس ملک میں کوئی مسلمان نہ رہا تھا اور مسجد میں اذان تک نہ ہوتی تھی لیکن اس کے وزیروں نے اتنی خوب صورت عمارت کو مسمار کرنے سے روکا۔ 15 ویں صدی تک یعنی کئی سو سال تک مسجد کی عمارت اسی طرح موجود رہی، البتہ 15ویں صدی میں آرچ بشپ آف کیتھولک چرچ کے مسجد کے بیچوں بیچ ایک کلیسا کی تعمیر کا حکم دے دیا۔ گرجا کی تعمیر پر آرچ بشپ خود اسے دیکھنے گیا تو اس نے پہلی بار آنکھوں سے مسجد کا شکوہ دیکھا اور کہا کہ بہتر ہوتا، میں اسے پہلے دیکھ لیتا تو اس کے وسط میں گرجا تعمیر نہ کرواتا کیوں کہ یہ عمارت اتنی خوب صورت ہے کہ اسے متاثر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آرچ بشپ نے کہا کہ زیادہ بہتر تھا، ہم مسجد ہی کو گرجا میں تبدیل کرنے کے لیے کوئی تدبیر کرتے۔ قرطبہ کے میونسپل ہال میں آج بھی یہ داستان محفوظ ہے۔ دُنیا بھر کے 14 لاکھ سیاح ہر سال مسجد قرطبہ کو دیکھنے کے لیے اسپین آئے ہیں۔ ☆☆☆

واہ، ضلع راول پنڈی کا تاریخی مقام ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جب اکبر بادشاہ نے اس علاقے کا دورہ کیا تو اس نے یہاں کے سبزہ زاروں اور شیریں پانی سے متاثر ہو کر کہا تھا: "واہ" اسی دن سے اس گاؤں کا نام واہ پڑ گیا لیکن اب یہ ایک پورا شہر ہے۔ واہ کینٹ 50 کلو میٹر شمال مغربی اسلام آباد میں واقع ہے۔ یہ تمام سمتوں میں پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک وادی ہے۔ واہ کینٹ ہمیشہ اعلیٰ خواندگی کی شرح سے پہچانا جاتا ہے۔ یہاں شرح خواندگی تقریباً 98 فی صد ہے۔

یہاں مختلف قوموں اور مذاہب کے لوگ اکٹھے رہتے ہیں۔ کراچی سے خیبر تک کا کلچر یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں کے باشندے ہنرمند اور پڑھے لکھے ہیں۔ زیادہ تر افراد فیکٹریوں میں کام کرتے ہیں یہاں صبح تو بہت خاموش ہوتی ہے لیکن شام کا وقت تمام رنگینیوں اور رونق کے ساتھ نظر آتا ہے۔ شام کے وقت بچے کھیل کے میدانوں میں نکل آتے ہیں اور کھیلتے ہیں۔ بوڑھے افراد گھاس پر بیٹھ کر ان کو کھیلتا ہوا دیکھتے ہیں۔ واہ کینٹ اعلیٰ شہری اور طبی سہولیات سے مزین ہے۔ اس شہر میں دو چارٹرڈ یونی ورسٹیاں ہیں۔ ایک میڈیکل کالج، ایک انجینئرنگ کالج اور بہت سے اسکول ہیں۔ یہاں سائیکلوں کی تعداد پورے پاکستان کے شہروں سے زیادہ ہے۔ یہ تاریخی شہر ٹیکسلا سے ملحق ہے۔

یہاں ایشیا کا بہت بڑا اسلحہ خانہ "پاکستان آرڈیننس فیکٹری" واقع ہے۔ واہ میں ایک ریلوے اسٹیشن اور چھاؤنی بھی ہے۔ اس کے دائیں جانب خان پور کے مالٹے اور کینو کے باغات ہیں۔ شمال مغرب میں مشہور مغل گارڈن، موضع واہ واقع ہے۔

مغل شہنشاہوں کا خوب صورت نظاروں سے لگاؤ، قدرتی اور حسین وادیوں سے محبت اور بہتے ہوئے پانیوں اور آبشاروں سے وابستگی نے مغل باغات کی روایت کو جنم دیا جن کا حسین امتزاج شالامار باغ لاہور اور یہاں پر مغلیہ باغ واہ میں نمایاں ہے۔ اس انداز کی جھلک ہمیں ان باغات میں ملی ہے جو مغلوں نے مقابر کے ساتھ بنوائے۔ شالامار باغ اور مغلیہ باغ واہ آپس میں بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ ان میں تمام روایتی اور تعمیراتی خصوصیات موجود ہیں، جس کے لیے مغلیہ باغات تمام عالم میں مشہور ہیں۔ شہنشاہ اکبر کے ایک نامور امیر راجہ مان سنگھ جو کہ جہانگیر کے برادرِ نسبتی تھے، یہاں پر دشمنوں کو اٹک پار رکھنے کے لیے مقرر ہوئے۔ انہی دنوں یہاں پر ایک حوض اور اس کے درمیان ایک بارہ دری بنوائی۔ شہنشاہ جہانگیر نے کابل جاتے ہوئے 1607ء میں اس جگہ قیام کیا اور حوض سے مچھلی کا شکار کیا۔ اپنی خودنوشت (Biography) "تزکِ جہانگیری" میں لکھتے ہیں۔

"بدھ کے دن 12 محرم 1016ھ (1607ء) کو بابا حسن

ابدال کے مقام پر اُترا۔ اس کے مشرقی جانب ایک کوس کے فاصلے پر ایک آبشار ہے جس کا پانی نہایت تیزی سے گرتا ہے۔ کابل کے پورے راستے میں اس جیسا کوئی آبشار نہیں ہے۔ کشمیر کے راستے میں دو تین جگہ اس قسم کے آبشار ہیں۔ اس تالاب کے درمیان جو اس آبشار کا منبع ہے، راجا مان سنگھ نے ایک مختصر سی عمارت تعمیر کرائی ہے۔ اس تالاب میں مچھلیاں بکثرت ہیں جو لمبائی میں آدھے گز اور پاؤ گز کی ہوں گی۔ تین روز تک اس دل کش مقام میں قیام رہا۔ میں نے اپنے مقرب مصاحبوں کے ساتھ مچھلی کا شکار کھیلا۔ میں نے اب تک سفرہ جال جو بہترین جال ہے اور جسے ہندی میں بھنور جال کہتے ہیں، کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ اس کا پانی میں ڈالنا مشکل کام ہے۔ میں نے اپنے ہاتھ سے اس جال کو پانی میں ڈالا اور دس بارہ مچھلیاں پکڑیں اوران کی ناک میں موتی پرو کر پھر پانی میں چھوڑ دیا۔

میں نے وہاں کے رہنے والوں اور مورخوں سے بابا حسن کے حالات پوچھے۔ کسی نے بھی کوئی صحیح بات نہیں بتائی۔ جو جگہ اس مقام میں مشہور ہے، وہ ایک چشمہ ہے جو ایک پہاڑی سے نکلتا ہے۔ اس کے پانی کی انتہائی لطافت، شیرینی اور نظافت پر امیر خسرو کا یہ شعر صادق آتا ہے:

در تہِ آبش زصفا ریگ خورد
کور تواند بدل شب شمرد

خواجہ شمس الدین محمد خوافی نے جو ایک مدت تک میرے والد بزرگوار کے عہد میں عہدۂ وزارت پر مامور تھا، وہاں ایک چبوترہ اور اس کے درمیان میں ایک حوض بنوایا ہے۔ چشمے کا پانی اس حوض میں آتا ہے اور وہاں سے کھیتوں اور باغوں کی آبپاشی میں صرف ہوتا ہے۔"

شاہ جہاں نے تخت نشینی کے بعد 1639ء میں کابل جاتے ہوئے پہلی بار یہاں قیام کیا اور اپنے مرکزی محکمہ تعمیرات کو یہاں بلایا اور عمارت کو ازسرِنو تعمیر کا حکم دیا۔ اس دور کے ماہر تعمیرات احمد معمار لاہوری نے یہاں کے باغوں، محلات اور سرائے کے نقشے تیار کیے اور 2 سال تک اپنی زیرِ نگرانی تعمیر کروایا۔ اس باغ کی تعمیر مغلیہ طرز پر کی گئی ہے اور اس میں خوب صورت بارہ دریاں، فوارے، نہریں اور آبشاریں بنوائیں۔ بڑی بارہ دری کے جنوبی پہلو میں گرم اور سرد دونوں قسم کے ملے ہوئے پانی کے حمام تعمیر کیے گئے۔ بارہ دریوں کے اندرونی حصے میں مصالحے سے استرکاری

کی گئی ہے۔ چھوٹے کمروں کی دیواروں کو پھول اور پتیوں اور نقش و نگار سے سجایا گیا ہے۔ اس کے بعد شاہ جہاں چار مرتبہ (1646ء تا 1654ء) کابل جاتے ہوئے اور واپسی پر ہمیشہ اسی باغ میں فروکش ہوا۔

شاہ جہاں کے ہم عصر مؤرخین عبدالحمید لاہوری نے اس باغ بہشتِ امین اور محمد صالح کنبوہ نے قائم مقام 'گلستانِ ارم' کے القاب سے منسوب کیا۔ اورنگ زیب عالم گیر آخری مغل فرماں روا تھا جس نے حسن ابدال میں ڈیڑھ سالہ قیام (6 جولائی 1674ء تا 1676ء) کے دوران اس باغ میں کچھ عرصہ قیام کیا۔ اس کے بعد اس کی زبوں حالی کا دور شروع ہوا۔ خاص طور پر درانی اور سکھ دور میں اس باغ کو بہت نقصان پہنچا۔ یہاں جو کچھ بھی تھا، تباہ ہو کر رہ گیا۔ برطانوی دورِ حکومت میں اس باغ کو واہ کے نواب حیات خان کی تحویل میں دے دیا گیا۔ اس باغ کی تاریخی اور تعمیراتی اہمیت کے پیشِ نظر 1976ء میں باغ حکومت پاکستان نے لے لیا اور دیکھ بھال اور مرمت کے لیے محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں دے دیا گیا۔ اس باغ کی باقاعدہ بحالی اور تحفظ پر کام شروع کیا گیا ہے۔ بڑے حوض، نہروں راستوں اور باغ کی چار دیواری کا کام تکمیل کے قریب ہے۔ پتھر کی جالیوں، بارہ دریوں، حمام اور آبشاروں کی مرمت، نیز باغ میں مغلیہ دور کی شجرکاری کا کام بھی جلد مکمل کر لیا جائے گا۔

☆☆☆

گلہری کا خزانہ

احمد عدنان طارق

برف کے گالے اب موتیوں کی طرح جنگل کے درختوں کی شاخوں پر چمکنے لگے تھے۔ ایک مدت ہوئی ان درختوں سے پتے جھڑ کر زمین پر گر چکے تھے اور وہ ٹنڈ منڈ کھڑے اب برف گرنے سے سردی کی شدت جھیل رہے تھے۔ جنگل کے فرش پر بھی کسی قسم کی کوئی حرکتِ نظر نہیں آتی تھی، ماسوائے کبھی کبھار کوئی بھورا سوکھا پتا ہوا سے اُڑتا تو اس کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی۔ مستقل آوازوں میں ہوا چلنے کی سرسراہٹ اور لومڑیوں کی بھوک سے بین کرنے کی تھیں۔ برگد کے ایک درخت کی سب سے اونچی شاخ پر ایک بھورے رنگ کی گلہری گہری نیند سو رہی تھی۔ اگرچہ وہ لومڑی کی آواز نہیں سن سکتی تھی، اس کے باوجود کبھی کبھی وہ نادانستہ طور پر اپنے ننھے پاؤں چھاتی سے، سختی سے لگا کر گول مٹول شکل اختیار کر لیتی۔ اس نے بڑی محنت سے پتوں اور بیلوں سے اپنا گھر بنایا تھا جو بہت نرم اور آرام دہ تھا۔ اس گھر میں وہ سرد ہوا اور گرتی ہوئی برف سے محفوظ تھی۔ یہ گلہری سردیوں کی آمد سے سو رہی تھی۔ کبھی کبھار جب سردیوں میں بھی سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمکتا تو وہ اپنی ناک سکیڑتی اور گھر سے باہر جھانکتی۔ باہر اتنی سردی ہوتی کہ اگر اس کا ارادہ شکار پر جانے کا ہوتا یا کچھ کھانے کی تلاش کا تو وہ فوراً یہ خیال سر سے جھٹک دیتی۔ ویسے بھی اس نے ساری گرمیاں اور خزاں کا موسم اپنا پیٹ بھرنے میں ہی گذارا تھا، لہٰذا اب سردیاں وہ بغیر کھائے پیئے سو کر گزار سکتی تھی۔

یہ چھوٹی گلہری تو تمام سردیاں سوئی رہی تھی اور اسی طرح جنگل میں دوسرے ننھے منے جانور بھی اپنی نیند پوری کر رہے تھے، لیکن اب وہ وقت آ گیا تھا جب موسم بدل رہا تھا۔ شاخوں پر ننھے پتے بننا شروع ہو گئے تھے اور بڑی شدت سے دھوپ ہونی شروع ہو گئی۔ برف کئی دن پہلے ہی پگھل چکی تھی اور آسمان کا رنگ بھی گہرا نیلا ہو گیا تھا۔ پھر اگلے دن گرمی زیادہ تھی جس کا مطلب تھا کہ موسمِ بہار پوری شان سے آن پہنچا تھا۔ گرمی لگی تو گلہری کے خوابیدہ بدن نے بھی پھریری لی۔ سورج کی تمازت سے اس کے پیٹ میں جیسے گدگدی سی ہونے لگی تھی اور اس گدگدی سے اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ اسے بھوک لگ رہی ہے۔ اپنے گھر سے اس نے درخت کے نیچے دوبارہ رواں دواں زندگی کو دیکھا۔ درخت کے تنے میں جڑوں کے قریب اسے دوبارہ سبز رنگ اُگتا نظر آیا۔ گلہری پریشان تھی کہ وہ سال کے آغاز میں کھانے کے لیے کہاں سے کچھ ڈھونڈ سکتی ہے، لیکن پھر اچانک اسے ایک بڑی ضروری بات یاد آ گئی۔

کئی ماہ پہلے اسے ایک اخروٹ کا درخت ملا تھا اور اس نے

اخروٹ اُتار کر ان کا ذخیرہ کر لیا تھا۔ یہ واقعہ یاد کر کے گلہری کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ فوراً اپنے گھر سے نکلی اور شاخوں پر دوڑنے لگی۔ اس کام کی وہ بہت ماہر تھی۔ اس کے ننھے پاؤں شاخوں پر جیسے جڑتے جاتے اور بغیر ہچکچاہٹ وہ ایک درخت سے دوسرے درخت پر کود جاتی اور اس کام میں اس کی موٹی اور مضبوط دُم اس کی مدد کرتی۔ وہ درختوں پر جتنی اونچائی تک جاتی، اسے کسی قسم کا کوئی ڈر محسوس نہیں ہوتا۔ یہی درختوں کی پھننگیں اس کا گھر تھیں اور وہ وہاں ہمیشہ خوش رہتی تھی۔ اخروٹ اس نے درخت پر نہیں چھپائے تھے بلکہ زمین میں اس نے کئی ننھے گڑھے کھود کر ان میں اخروٹ دبا دیئے تھے۔ اب اسے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس نے صرف اپنے چھپائے ہوئے اخروٹ ڈھونڈنے تھے اور سردیوں کے بعد پہلا کھانا کھانا تھا۔ گلہری خوشی خوشی پھدکتی ہوئی درخت کے تنے سے نیچے اُتری اور اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ اسے بخوبی علم تھا کہ وہ جلد ہی اپنا دبایا ہوا خزانہ ڈھونڈ لے گی، لیکن وہ یہ بات بھول گئی تھی کہ برف گرنے سے جگہیں کتنی مختلف لگنے لگتی ہیں۔ وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ جہاں اس نے اخروٹ دبائے تھے، وہاں قریب ہی ایک جھاڑ تھی جس پر سرخ اور نارنجی پتے اُگے ہوئے تھے لیکن اب تو وہاں کوئی پتا بھی نہیں بچا تھا اور بڑی جھاڑیوں کا بھی صرف جھاڑ جھنکار ہی بچا تھا۔ اب جھاڑیوں میں تمیز تقریباً ناممکن تھی۔

گلہری کو ایک اور نشانی بھی یاد آ گئی۔ جہاں اس نے اخروٹوں کا خزانہ دبایا تھا، وہاں قریب ہی بہت سی سرخ اور سفید دھبوں والی کھمبیاں اُگی ہوئی تھیں، لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ اب وہ کھمبیاں بھی غائب ہو چکی تھیں۔ اب تو گلہری کو فکر لاحق ہو گئی۔ کیا ہو گا، اگر اسے دبائے ہوئے اخروٹ نہیں ملے تو؟ وہ تو موسمِ بہار میں مکمل خوراک ملنے تک بھوکی مر جائے گی۔ پھر جلدی جلدی سورج کی روشنی بھی کم ہونے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ جلد ہی اندھیرا چھا جائے گا اور سردی بڑھ جائے گی۔ گلہری جلدی سے اپنے گھر میں واپس چلی گئی جہاں وہ دوبارہ اگلی صبح تک مطمئن ہو کر سو سکے۔ جب وہ لیٹی تو سوچ رہی تھی کہ آج اسے ایک بھرپور نیند سونا چاہیے اور پھر کل وہ اپنے خزانے کو ڈھونڈے گی لیکن اگلی صبح تک اسے یاد نہیں آیا کہ اس نے اخروٹ کہاں چھپائے تھے۔ اس نے سوچا کہ وہ میدان میں دیکھتی ہے جہاں سے کھدائی کا کوئی نشان ملے لیکن پھر وہ یہ سوچ کر پریشان ہو گئی کہ جہاں سے اس نے زمین کھودی تھی، وہاں اس نے مٹی ڈال کر جگہ برابر کر لی تھی۔

سارا دن بھوکی پیاسی وہ اخروٹوں کو ڈھونڈتی رہی۔ وہ اخروٹوں کے بارے میں اتنا سوچ رہی تھی کہ اسے یاد ہی نہیں رہا کہ جنگل میں اور بھی خطرات موجود ہیں۔ وہ جیسے ہی برگد کے درخت کے نیچے پہنچی تو اس کی لاپروائی اس کے آڑے آئی اور اس کا سامنا ایک لمبے، کمزور اور سرخی مائل جانور سے ہو گیا۔ یہ ایک لومڑی تھی۔ معاملہ ویسے تو عام طور پر یوں ہوتا ہے کہ لومڑیاں گلہریوں کو نہیں پکڑتیں کیوں کہ وہ درختوں پر چڑھ نہیں سکتیں لیکن ایک

بھوکی لومڑی اپنا شکار کیسے چھوڑ دیتی جو خاص طور پر چھلانگیں مارتے ہوئے اس کی طرف خود آ رہا ہو۔ چشم زدن میں لومڑی نے اپنے مضبوط جبڑے میں گلہری کی دُم کو قابو کر لیا۔ پھر اس نے بھینچے ہوئے جبڑوں کے باوجود پوچھا: ”بی گلہری! تم کیا کرتی پھر رہی ہو؟“ گلہری نے جلدی سے جواب دیا: ”میں...... میں اپنے خوراک کے خزانے کو ڈھونڈ رہی تھی۔“ ننھی گلہری اتنی خوف زدہ ہو چکی تھی کہ بے چاری کے منہ میں جو آیا اس نے کہہ دیا۔ لومڑی نے فوراً شوق سے پوچھا کہ خوراک کے خزانے سے اس کی کیا مراد ہے؟ گلہری کا دماغ تیزی سے چل رہا تھا وہ کہنے لگی: ”میرا مطلب ہے...... خرگوش...... مرغیاں اور دو بطخیں۔“ لومڑی نے ان جانوروں کا ذکر سنا تو فوراً اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ یہ گلہری سے کہیں مزے دار جانور تھے، بلکہ سچی بات یہ تھی کہ لومڑی نے ابھی تک کوئی گلہری نہیں کھائی تھی۔ اس نے گلہری سے پوچھا: ”اور تمہارا یہ خوراک کا خزانہ ہے کدھر؟“ گلہری کے اوسان اب بحال ہو رہے تھے۔ اس نے لومڑی کو بتایا: ”وہ ادھر کہیں تھے لیکن مجھے مل نہیں رہے ہیں۔ مجھے یاد نہیں آ رہا کہ میں نے انہیں کہاں چھپایا تھا۔ ہو سکتا ہے انہیں ڈھونڈتے اب مجھے کئی ہفتے لگ جائیں لیکن مجھے اُمید ہے کہ تم جس طرح سے اپنے مضبوط پنجوں سے زمین کھود سکتی ہو، تم اس خزانے کو منٹوں میں ڈھونڈ سکتی ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس درخت کے تنے کے قریب سے ہی اسے تلاش کرنا شروع کرنا چاہیے۔“

یہ سننا تھا کہ لومڑی نے سوچے سمجھے بغیر زمین کھودنی شروع کر دی۔ یوں لگتا تھا کہ مرغیوں، بطخوں اور خرگوشوں کے تصور نے ہی اسے پاگل کر دیا تھا۔ لیکن وہ کھدائی تیزی سے نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ ابھی بھی اس نے اپنے منہ میں گلہری کی دُم دبائی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے پنجوں سے برگد کے درخت کے نیچے اچھا خاصا گڑھا کھود لیا تھا، لیکن وہاں انہیں کچھ بھی نہیں ملا۔ گلہری نے جھٹ دوسرے درخت کی طرف اشارہ کر کے کہا: ”میرا خیال ہے کہ وہ درخت یہ تھا۔“ لومڑی کو معلوم تھا کہ وہ کوئی گھاٹے کا سودا تو کر نہیں رہی۔ فرض کریں، اگر اسے یہ خزانہ نہیں بھی ملتا تو پھر بھی کھانے کے لیے اس کے پاس ایک موٹی تازی گلہری موجود ہے۔ لومڑی نے جو اگلا گڑھا کھودا، وہ بھی خالی نکلا۔ لومڑی نے دانت بھینچے اور گلہری کو کہا: ”ایک گڑھا اور، ورنہ پھر میں تمہیں کھاؤں گی۔“ یہ کہہ کر لومڑی تیسرا گڑھا کھودنے لگی۔ تھوڑی سی مشقت کے بعد ہی گڑھے میں سے کچھ گول گول چمکتا ہوا نظر آنے لگا۔ لومڑی کو اپنی بینائی پر شک ہونے لگا۔ وہ سخت غصے میں تھی۔ اس نے غصے میں چیختے ہوئے منہ کھولا اور کہنے لگی: ”اخروٹ...... اخروٹ...... میرے کس کام کے ہیں؟“ لیکن جیسے ہی اس نے منہ کھولا، ننھی گلہری اس کے جبڑوں سے آزاد ہو گئی اور دس سیکنڈز میں وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی قریبی درخت کے پھننگ پر پہنچ گئی تھی۔ وہاں سے شوخی سے بولی: ”یہ اخروٹ تمہاری صحت کے لیے بہت اچھے ہیں۔ جنگل میں یہ مانا جاتا ہے کہ جو بھی ایک اخروٹ روز کھاتا ہے، ڈاکٹر ہمیشہ اس سے دُور رہتا ہے۔“ لومڑی غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔ اس نے وہی کیا جو غصے میں لومڑیاں کرتی ہیں۔ یعنی اپنی دُم کا تعاقب تیز تیز گھوم کر کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح وہ اپنی خفت مٹا رہی تھی۔ پھر وہ چہرے پر سختی اور پُرعزم تاثرات بنا کر درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ اس نے گلہری کو پکار کر کہا: ”ننھی گلہری! میں تمہارے نیچے اُترنے تک یہیں بیٹھ کر تمہارا انتظار کروں گی۔ تم کون سا ساری عمر درخت کے اوپر ہی گزار دو گی۔“ گلہری نے جواب دیا: ”ہرگز نہیں، لیکن میں بڑے مزے سے چھلانگ لگا کر ایک درخت سے دوسرے درخت تک جا سکتی ہوں۔ اس طرح دیکھو!“ یہ کہہ کر اس نے اپنی دُم کو اپنے پیچھے پھیلایا اور بڑے مزے سے چھلانگ لگا کر دوسرے درخت پر پہنچ گئی۔

اب کیا تھا، ظاہر ہے لومڑی جنگل کے ہر درخت کے نیچے بیٹھ کر پہرہ تو نہیں دے سکتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ پہلے ہی بہت بھوکی تھی، اب تو اس کا پیٹ یوں خالی تھا جیسے کوئی اندھیری غار، لہٰذا وہ غصے سے بڑبڑاتی ہوئی خوراک کی تلاش میں وہاں سے روانہ ہو گئی۔ رہ گئی ہماری گلہری تو اس نے کسی نہ کسی طرح اپنا خزانہ ڈھونڈ لیا تھا یا لومڑی سے تلاش کروا لیا تھا۔ وہ دوڑ کر نیچے اُتری اور جلدی سے جتنے اخروٹ اکٹھے کر سکتی تھی، اکٹھے کر لیے۔ اگرچہ گلہری کے بقیہ تمام اخروٹوں کے سوراخ نہیں مل سکے لیکن وہ اخروٹ جو زمین میں دبے رہ گئے تھے، ان سے اخروٹ کے نئے درخت اُگ گئے جن سے اخروٹ اُتار کر اس گلہری کے پوتوں اور نواسوں نے اپنا پیٹ مستقبل میں بھرا۔ گلہری کے آئندہ خاندان کے افراد کے بارے میں بچو میں آپ کو خوشی سے بتا دوں کہ وہ ہماری گلہری سے زیادہ ذہین تھے اور اتنے بھلکڑ نہیں تھے۔

☆☆☆

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتب لیجئے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 نومبر 2015ء ہے۔

اکتوبر 2015ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلس ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- ہم ہیں ماہیٔ بے آب کھانے پینے کو بے تاب (ایمن فاطمہ، ملتان)
- لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا (علینا اختر، کراچی)
- سکھیو یہ دعوتِ شیراز تو بہت خطرناک معلوم ہوتی ہے (مہوش، لاہور)
- تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے (مریم سارہ، چکوال)
- ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا (محمد حارث اللہ بخش، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

نونہال مصور

گول گپے والا

تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔

محمد زبیر جمشید علی، خانیوال (پہلا انعام: 195روپے کی کتب)

طیب منصور، فیصل آباد (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

ثمن اشرف، بھکر (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

محمد احمد جواد گل، چشتیاں (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

گل احمد شیخ، لاہور (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: محمد حسنین، اٹک۔ محمد شمعون بٹ، لاہور۔ وائق علی، شیخوپورہ۔ سمیعہ توقیر، کراچی۔ عیشہ فاطمہ، فیصل آباد۔ مقدس لطیف، اوکاڑہ۔ محمد حسن ندیم، کراچی۔ عائشہ اشفاق، منڈی بہاؤ الدین۔ عبداللہ خان، راول پنڈی۔ قدر ڈار، ہاجرہ ڈار، گوجرانوالہ۔ محمد حیدر علی، اٹک۔ زرنین عبداللہ، راول پنڈی۔ ساریہ نعمان، سیدہ تحریم عتبان، لاہور۔ ام رومان، چنیوٹ۔ فاطمہ نواز، گوجرانوالہ۔ زوبیہ اشرف، لاہور۔ ذوالقرنین رانجھا، جھنگ۔ تانیہ توفیق، بھکر۔ شمیم ناز، ثمرین نثار، فوزیہ جلیل، محمد حسین، کوئٹہ۔ زہران، لاہور۔ عاصمہ عامر، راول پنڈی۔ عائشہ ندیم، کراچی۔ روحی فاطمہ، بشریٰ نازنین، گجرات۔ سالار، مری۔ حافظہ منیر، رحیم یار خان۔ وحید احمد، ڈیرہ اسماعیل خان۔ محمد اویس، اسلام آباد۔ محمد عثمان، کراچی۔ رمیض اسلم، فیصل آباد۔ نعمان انجم، ایبٹ آباد۔ زوہیب ارسلان، میاں والی۔ عامر فیصل، کراچی۔ اسد جاوید، لاہور۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

آخری تاریخ 8 دسمبر

آخری تاریخ 8 نومبر

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES